REGD. N. A 466

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

ترجمان

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی بہم سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر سوز خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ہاروت۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نورِ محمدی اور پل صراط، آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۴۶ صفحات کاغذ سفید دبیز۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت

چار روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالاتِ ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی کی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت

پانچ روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دل کش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

۱۹۵۵ء کا سالنامہ

(علماء اسلام نمبر)

سالگزشتہ میں نے سالنامہ ۵۴ء کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ "فرمانروایان اسلام" نمبر کے بعد میں "علماء اسلام" اور "اماکن اسلام" کا سلسلہ شروع کروں گا تاکہ اس طرح رفتہ رفتہ دو چار سال میں "تاریخ اسلام" کا وہ باب جو ترقی علوم و فنون سے متعلق ہے مکمل ہو جائے، چنانچہ اس کا ایک حصہ "فرمانروایان اسلام" آپ کی نگاہ سے گزر چکا اور اب آیندہ سال کے لئے اس سلسلہ کا دوسرا حصہ پیش نظر ہے جو "علماء اسلام" سے تعلق رکھتا ہے۔

اس خاص نمبر میں عرب، ایران، اسپین، مصر، ہندوستان وغیرہ کے ان تمام اکابر علم و ادب کا ذکر کیا جائے گا جنھوں نے کسی خاص فن یا شعبۂ علم کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہے اور کوئی نہ کوئی تصنیف اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا خاص لحاظ رکھا جائے گا:-

۱- پورا نام معہ ولدیت و کنیت وغیرہ کے

۲- تاریخ ولادت و وفات سنہ ہجری و سنہ عیسوی کے تطابق کے ساتھ

۳- مختصر حالات زندگی اور خاص خاص کارنامے

۴- اہم تصانیف کی فہرست

۵- حوالہ جات جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ تاریخ کی کن کن کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے

۶- ایک انڈکس حروف تہجی کے لحاظ سے اور دوسرا علم و فن یا زمانہ کے لحاظ سے

اس خاص نمبر میں عہد نبوی سے لیکر عہد حاضر تک کے تمام ماہرین تفسیر و قرآن۔ ائمۂ حدیث، فقہاء، حکماء، اطباء، متکلمین، ماہرین لسانیات و ادب، علماء فلکیات و ریاضیات، طبیعیات و نفسیات، علماء تاریخ و جغرافیہ، سوانح نگاروں اور سیاحوں کا ذکر کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں ان صوفیہ اور شعراء کا بھی ذکر ہوگا جو کوئی خاص علمی یا ابداعی حیثیت رکھتے تھے۔ میں نے اس سالنامہ کی ترتیب شروع کر دی ہے۔ اس دوران میں جو کام ہوگا اس کی نوعیت و ترقی کی اطلاع ہر ماہ آپ کو دیتا رہوں گا اور وقتاً فوقتاً اسکے بعض اجزاء بھی پیش کرتا رہوں گا، تاکہ آپ کو کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۸) میرا خیال ہے کہ کم و بیش چھ سات سو علماء کا ذکر اس سلسلہ میں مجھے کرنا پڑے گا ـــــ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ سالنامہ کو کیوں نہ کتابی سائز پر شایع کیا جائے؟ ـ لیکن یہ میری قطعی رائے نہیں ہے۔ اگر قارئین نگار نے اسے پسند نہ کیا تو پھر اسے نگار ہی کے سائز پر شایع کیا جائے گا

نیاز

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے
"نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی پی ہوگا

نگار

اس امر کی کہ آپ کا چندہ مارچ میں ختم ہوگیا اور اپریل کا
جس میں سالنامہ ۵۵ء کی قیمت بھی شامل ہو

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۵ | فہرست مضامین مارچ ۵۴ء | شمار ۳

ملاحظات ---------- ۲
غالب اور میرٹھ ---- شوکت سبزواری ---- ۵
وحید الہ آبادی اور ان کے بعض تلامذہ --- ولی کاکوی --- ۱۱
گاہے گاہے باز خواں ---------- ۲۰
زیب النساء ---------- ۲۵
ہوا کے کرشمے ---------- ۳۳
دعوت نقد و نظر ---------- ۳۷
باب الاستفسار ---------- ۴۷
منظومات... دل - اکرم - رضوی - کیفی - ساحر ---- ۴۹
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۲

ملاحظات

اندیشہ ہائے دور و دراز

آخر کار پاکستان اور امریکہ و ترکی کا اتحاد ثلثہ ہو ہی گیا اور وہ بات ہو کر رہی جس کو مشرق ادنیٰ سے لیکر مشرق بعید تک کی تمام مسلم و غیر مسلم حکومتیں تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

اس دوران میں سب سے بڑا مسئلہ جس نے ایشیا کی تمام حکومتوں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا، وہ یہی مسئلہ تھا اور جس تدریج و تدبیر کے ساتھ یہ طے پایا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت دنیا میں سیاسی کھیل کس طرح کھیلے جاتے ہیں اور کن کن چالوں سے فضا کو استوار کیا جاتا ہے۔ اول اول جو خبریں امریکہ، انگلستان، روس، فرانس اور خود پاکستان کی طرف سے شایع ہو رہی تھیں، وہ اقرار و انکار، تذبذب و یقین اور بیم و رجا کا ایسا اُلجھا ہوا لٹریچر تھیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ہم کسی واضح نتیجہ تک نہیں پہونچ سکتے تھے اور اس طرح یہ مسئلہ ایک معمہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس فوجی معاہدہ کی افواہ تو بہت پہلے ہی اڑ چکی تھی، لیکن سب سے پہلے "نیویارک ٹائمس" کے نمایندۂ کراچی نے یہ خبر شایع کرکے کہ "پاکستان نے امریکہ اور دوسری مغربی حکومتوں کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے" اس کی توثیق کر دی — اور چونکہ پاکستان کی طرف سے اسکی کوئی تردید شایع نہیں ہوئی تھی، اس لئے لوگوں کو یہ یقین کرنے کا موقع مل گیا تھا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان واقعی فوجی معاہدہ ہونے والا ہے۔ اسی سلسلہ میں بعد کو فرانس کے ایک نہایت مقتدر اخبار "ٹریبیون ڈانیشنس" نے یہ اطلاع شایع کی کہ "مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان ماہ نومبر میں صدر امریکہ اور ڈلس سے گفتگو کر چکے ہیں اور اس معاہدہ کی خاص خاص شرائط یہ ہیں :-

۱۔ پاکستان مناسب وقت پر مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں شرکت کے لئے آمادہ ہے۔
۲۔ پاکستان، امریکہ کو اجازت دے گا کہ وہ اپنی فوجیں مغربی و مشرقی پاکستان میں رکھے اور فوجی مراکز قایم کرے۔
۳۔ امریکہ، پاکستان کو ۲۰ کروڑ ڈالر اس غرض سے دے گا کہ وہ امریکہ سے اسلحہ خریدے، اپنی فوج کو از سر نو مرتب کرے جس کی تعداد ۹ لاکھ ہوگی، اس کے علاوہ امریکہ ۸۰ ٹینک بھی دے گا اور ۸۰ ہوائی جہاز بھی جن میں ۵۰ جٹ قسم کے ہوں گے۔
۴۔ پاکستانی فوج کی تنظیم و تربیت امریکہ کے فوجی افسروں کے سپرد ہوگی۔

یہ بڑی واضح و روشن اطلاع تھی جس کو دُنیا کے اخباروں نے شایع کرکے ساری دُنیا کو یقین دلا دیا کہ پاکستان و امریکہ کا فوجی معاہدہ بڑی حد تک حقیقت میں تبدیل ہوچکا ہے اور اس کے نتائج پر اظہار رائے ہونے لگا۔

اسی زمانہ میں جب مسٹر غلام محمد ترکی گئے تو وہاں کے ایک اخبار ظفر نے ترکی کے ایک مشہور فوجی تبصرہ نگار کا ایک بیان شایع کیا کہ "ایران کے حالیہ انقلابات کے پیش نظر اس کا قوی امکان ہے کہ پاکستان، ایران، ترکی کے ساتھ ملکر مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم میں نمایاں حصہ لے اور اس طرح اتحادِ اٹلانٹک کا سلسلہ بحر ہند کے سواحل تک وسیع ہوجائے جسے کامیاب بنانے کے لئے امریکہ کو قدرتاً پاکستان میں اپنے فوجی مرکز قایم کرنا پڑیں گے اور جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ عرب حکومتیں بھی اس دفاعی تنظیم میں شریک ہوجائیں گی" چنانچہ سر ظفر اللہ خاں کا مشرق وسطیٰ کے ممالک میں سیاحت کے لئے جانا، اسی پروگرام کی ایک کڑی ہے جس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ ۱۹ر دسمبر کو دمشق پہونچے تو ریڈیو بیروت نے یہ خبر نشر کی کہ حکومت شام کے ذمہ دار افسروں سے سر ظفر اللہ اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔

اب خود امریکہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہاں کے اخباروں نے اس معاہدہ کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور نیویارک ہیرالڈ ٹریبون نے تو یہاں تک لکھدیا کہ "سوویٹ ایشیا کے چاروں طرف ہوائی اڈے قایم کرنے کے لئے پاکستان بڑی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ فلپین اور ترکی کے درمیان کوئی ہوائی مرکز امریکہ کا نہیں ہے اور اس لئے پاکستان میں ہوائی مرکز قایم ہونا ضروری ہے۔

ان خبروں کے ساتھ ساتھ جو بیانات پاکستان کی طرف سے شایع ہوئے، وہ ہر چند بہت مبہم تھے، لیکن ان سے یہ پتہ تو ضرور چلتا تھا کہ وہ اس فوجی معاہدہ کی کوشش کر رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ کبھی وہ یہ کہتا تھا کہ یہ امداد صرف خریداری اسلحہ تک محدود ہوگی اور کوئی فوجی اڈا امریکہ کو بنانے نہ دیا جائے گا۔ کبھی وہ شد و مد کے ساتھ یہ اعلان بھی کرتا تھا کہ پاکستان خود مختار ملک ہے اور فوجی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لئے ہر قربانی کے لئے آمادہ ہے۔ بہر حال اس سے چند دن قبل تک دنیا کے اخبارات اور پاکستان کی طرف سے جو بیانات شایع ہوئے، ان سے یہ تو یقینی طور پر معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ اس کا خواہشمند ہے کہ وہ پاکستان کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی سے فایدہ اُٹھاکر وہاں اپنے فوجی مرکز قایم کرے اور پاکستان بھی بڑی حد تک اس کے لئے راضی ہے، لیکن اس معاہدہ کی تکمیل میں برابر التوا و تعویق ہوتی جارہی تھی، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ جنوبی ایشیا کی کوئی سلطنت ایسی نہیں جو اس معاہدہ کی مخالف نہ ہو۔ سوویٹ حکومت، جمہوریت چین، برما، افغانستان، لنکا، نیپال بعض عرب حکومتیں، انڈونیشیا اور ہندوستان سب اس معاہدہ کے خلاف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار پرزور الفاظ میں کر رہے تھے یہاں تک کہ خود امریکہ میں بھی ایک جماعت ایسی ہے جو اس معاہدہ کو امریکہ کے لئے نقصان رساں سمجھتی تھی، اس لئے امریکہ سوچ رہا تھا کہ ایشیا کی اتنی حکومتوں کی مخالفت کے باوجود اگر اس نے پاکستان سے کوئی فوجی معاہدہ کرکے وہاں اپنے فوجی اڈے قایم کرلئے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ لیکن اب تمام نتائج پر غور کرنے کے بعد آخرکار اس نے وہی فیصلہ کیا جو ممکن ہے وقتی طور پر پاکستان کی بعض اقتصادی و سیاسی مشکلات کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے کہ، لیکن وہ تمام ایشیائی حکومتوں

کے لئے مشکل سے قابلِ قبول ہوسکتا ہے

ابھی تک امداد کی نوعیت و تفصیل کا علم ہم کو نہیں ہے اور گو کہا یہی جاتا ہے کہ یہ فوجی امداد بڑی حد تک اخلاقی حیثیت رکھتی ہے اور پاکستان کی آزادی و سالمیت کو اس سے کوئی ضرر نہ پہونچے گا، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ امریکہ نے جب کسی ملک کو کوئی امداد دی ہے تو یہی کہکر دی ہے کہ وہ اس کی آزادی نہیں چھیننا چاہتا، لیکن سودے کی نوعیت ہمیشہ کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کہ آزادی و خود مختاری کا مفہوم خود بخود بدل جاتا ہے اور احساس گرانباری کا نفسیاتی ردِ عمل یہی ہوتا ہے کہ احسان کرنے والے کی خواہش کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس امداد کے سلسلہ میں امریکہ کا ڈالر کثیر مقدار میں پاکستان آجائے گا، اس کے بعض تعمیری منصوبوں کو بھی ایک حد تک پنپنے کا موقع مل جائے گا، جدید عسکری تنظیم کے سلسلہ میں کچھ لوگ کام سے لگ جائیں گے، اور ہندوستان کے مقابلہ میں اس کا احساس کمتری بھی بڑی حد تک دور ہوجائے گا، لیکن اسی کے ساتھ اس کی خودداری کو جو نقصان پہونچے گا، اس کی تلافی شاید کسی طرح ممکن نہ ہو۔ یہ تو ہوا صرف نفسیاتی پہلو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی نقطۂ نظر سے بھی یہ اتحاد پاکستان کے لئے مفید ثابت ہوتا نظر نہیں کرتا۔ کیونکہ امریکہ کی یہ تمام مہربانیاں پاکستان پر صرف اس لئے ہیں کہ وہ روس سے قریب تر واقع ہے اور روس سے قریب تر ہونے کے معنی یہی ہیں کہ بصورت جنگ سب سے پہلے اسی کو بھینٹ چڑھایا جائے۔

امریکہ کی موجودہ جنگی پالیسی اس دوران میں بہت بدل گئی ہے۔ اور کوریا کی جنگ نے اس کو بتادیا ہے کہ ملک سے باہر کسی دور دراز مقام پر لڑائی چھیڑنا آسان بات نہیں اور اس میں کامیابی اسی وقت ہوسکتی ہے جب محاذِ جنگ سے قریب تر ملکوں کو بھی اس میں شامل کیا جائے، اس سے ایک فایدہ تو یہ ہوگا کہ دشمن پر حملہ کرنے کے لئے اسے قریب تر فوجی مرکز ہاتھ آجائیں گے اور دوسرے یہ کہ خود اس کی فوج اور اس کا ملک بڑی حد تک تباہی سے محفوظ رہے گی۔ چونکہ مستقبل کی جنگ آٹمی جنگ ہوگی اور اس میں وہی ملک کامیاب ہوسکتا ہے، جو سب سے پہلے آٹم بم استعمال کرسکے، اس لئے اگر امریکہ و روس کے درمیان کبھی جنگ ہوئی جس کا اندیشہ ہر وقت کیا جاتا ہے تو امریکہ اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ روس سے قریب تر اپنے فوجی مرکز بناکر جلد سے جلد بمباری کرسکے اور اس کے لئے پاکستان کے دونوں حصے نہایت ضروری ہیں۔ کیونکہ لداخ کی طرف سے وسط ایشیا میں اور مشرقی بنگال کی طرف سے مشرق بعید میں روس و چین کی اشتراکی حکومتوں کو جلد سے جلد چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

گو بہ حالات موجودہ روس و امریکہ کے درمیان کسی فوری جنگ کا امکان ضعیف ہے، لیکن جلد یا بدیر جنگ ہونا یقینی ہے اور اس ہولناک نامعلوم وقت کے لئے دونوں طرف جنگی طیاریاں ہو رہی ہیں جس کا نام کولڈ وار یا ٹھنڈی لڑائی ہے اور جس نے اس وقت دُنیا کے تمام بین الاقوامی اقتصادیات کو درہم برہم کر رکھا ہے۔

ان حالات میں پاکستان کا یہ سمجھنا کہ وہ امریکہ کی فوجی امداد سے کوئی خاص فایدہ اُٹھاسکے گا صحیح نہیں، کیونکہ پاکستان، ایشیا کا ملک ہے اور ایشیائی حکومتوں ہی سے ملکر وہ ترقی کرسکتا ہے اور ایشیائی ممالک کبھی اس کو پسند نہیں کرسکتے کہ امریکہ یا کوئی مغربی حکومت سرزمین ایشیا میں اپنے پاؤں جمائے۔

اپنا سلسلۂ خریداری جاری رکھئے ورنہ

آپ آیندہ سالنامہ ۱۹۵۵ء (علماء اسلام نمبر) سے محروم رہیں گے اور یہ محرومی شاید آپ کو گوارا نہ ہو۔

سالنامہ ۵۵ء کی اہمیت کا اندازہ ایک حد تک صفحہ (۱) کے اشتہار سے ہوسکے گا۔ اس کے اقتباسات بھی وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہیں گے، چنانچہ اس اشاعت میں نمونہ کے طور پر "خانخاناں" کے حالات کا اقتباس دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۴۸)

منیجر نگار

غالب اور میرٹھ

غالب کے عام حالات اور زندگی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس بڑے شاعر کی زندگی کے کچھ گوشے آج بھی ایسے ہیں جو ہنوز تاریکی میں ہیں اور بہت سے حالات اچھی طرح روشن ہوکر ابھی ہمارے سامنے نہیں آئے۔ غالب نے یوں تو آگرہ میں ہوش سنبھالا اور وہیں نشوونما پایا۔ لیکن ان کے جوہر جہان آباد کی خوشگوار اور نغمہ پرور فضا میں آکر کھلے۔ غالب کا تعلق براہ راست ان دو مردم خیز اور نشاط انگیز سرزمینوں سے رہا۔ اس لئے اہلِ علم نے ان کی زندگی پر سے پردہ اُٹھاتے ہوئے زیادہ تر انہی دو مقامات کی جغرافیائی حدود تک اپنی نظروں کو محدود رکھا اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ آگرہ اور دلّی میں گزرا۔ یہیں انھوں نے لیل و نہار کے انقلاب اور فلک کج رفتار کی نیرنگیوں کا تماشا دیکھا۔ ان کے دوست دشمن، موافق مخالف زیادہ تر یہیں کے تھے اور زندگی نام لیل و نہار کی اُلٹ پھیر کا ہے جس میں دوست کی جاں نثاری کو دخل بھی ہے اور دشمن کی آویزش کو بھی

آگرہ اور دلّی کے بعد غالب کی زندگی کے کچھ ایام کلکتہ میں گزرے جن کے گہرے تاثرات بہت بعد تک ان کے دل پر نقش رہے اور ان کی یاد تیر و نشتر کا کام کرتی رہی

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

دارالسرور رام پور سے بھی غالب وابستہ رہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے آخری ایام میں جو ایک طرح کی تلخی آگئی تھی دربار رام پور سے تعلق کی بنا پر ہی ان میں کسی قدر خوشگواری کا رنگ آیا۔ غالب کی زندگی کے ان پہلوؤں پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مولانا عرشی اور مالک رام، غالب کے دربار رام پور سے تعلق پر بہت کچھ لکھ چکے

ان مقامات کے علاوہ غالب کی زندگی کا ایک نشتر یہ بھی ہوگئے اور اگرچہ کلکتہ کی سی اہمیت اس کے حصّے میں نہ آئی۔ لیکن غالب کی ادبی زندگی کی تعمیر اور اس کی صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے میں نے کلکتہ سے کچھ زیادہ ہی حصہ لیا۔ کلکتہ میں غالب کے کلام پر اعتراضات ہوئے "قاطع برہان" کا ایک مدلل جواب یہاں سے شایع ہوا۔ کلکتہ کے احباب سے نامہ و پیام کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ لیکن میرٹھ نے کلکتہ سے زیادہ غالب سے فیض اُٹھایا اور کلکتہ سے زیادہ یہاں کی ادبی تحقیقات اور فنی کارناموں کو جرح و طعن کا نشانہ بنایا۔ اس لئے ان کی شخصیت یہاں زیادہ اُبھر کر سامنے آئی۔ ان کے کلام کا حُسن، اخلاق کے پہلو اور طبیعت کے جوہر یہاں زیادہ چمکے

(۲)

اس اجمال کی تفصیل ذرا تطویل کی خواہاں ہے۔ میرٹھ کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے اس کے سر اولیت کا سہرا باندھا غالب کے اُردو مکاتیب کی اشاعت ہے۔ غالب اپنے اُردو کلام کی طرح اُردو خطوط کو بھی بہت بے وقعت اور ہیچ سمجھتے تھے۔ منشی شیونرائن اور ہرگوپال تفتہ نے ان کے خطوط کا مجموعہ شایع کرنا چاہا تو مرزا نے سختی سے ان کو روکا اور زور دیکر منشی شیونرائن کو لکھا کہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور مرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔ یہ واقعہ نومبر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ اس کے کوئی دو سال بعد منشی ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ جو مرزا کے خاص احباب میں سے تھے، کسی ضرورت سے مارہرہ گئے وہاں منشی عبدالغفور سرور نے ایک خاص صحبت میں غالب کے اُردو خطوط جو ان کے نام آئے تھے منشی صاحب کو سُنائے منشی صاحب کو ان کا انداز بہت بھایا۔ انھوں نے سرور سے کہا کہ اگر یہ خطوط تم جمع کر دو تو میں ان کے انطباع کا بیڑا اُٹھاتا ہوں۔ سرور راضی ہوگئے

منشی ممتاز علی میرٹھ چلے آئے اور اس فکر میں رہے کہ اگر کچھ اور خطوط دستیاب ہو جائیں تو ان سب کو یکجا کر کے شایع کریں۔ مولانا عرشی کا بیان ہے کہ انھیں خواجہ غلام غوث بے خبر کے مجموعے کی خبر ملی جو غالب کی اجازت اور ان کی مرضی سے ترتیب دیا جا رہا تھا۔ اور غالب اس کے لئے اپنے عزیزوں اور دوستوں سے خطوط کی نقلیں حاصل کر رہے تھے۔ منشی صاحب نے بے خبر کو لکھا کہ وہ یہ مجموعہ ان کے حوالے کر دیں۔ وہ اس کو اپنے اہتمام سے طبع کرائیں گے۔ بے خبر نے غالب سے مشورہ کیا۔ غالب منشی صاحب سے واقف تھے۔ اس لئے انھوں نے اس انتظام پر اطمینان کا اظہار کیا جب بے خبر نے دوبارہ لکھا تو تحریر فرمایا:-

"حضرت پیر و مرشد اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے اور وہ میرے دوست ہیں"[1]

یہ صحیح نہیں۔ بے خبر، غالب کے خطوط کا کوئی مجموعہ شایع کرنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے اور نہ انھوں نے از خود غالب کے خطوط فراہم کئے۔ یہ سب کچھ منشی ممتاز علی کی تحریک سے ہوا۔ منشی صاحب نے طلب و جستجو میں انھیں اپنا معاون بنایا۔ ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے "مخلص با اختصاص" مرزا غالب کے اردو خطوط کی نقلیں جس طرح بھی ہو ان کو مہیا کریں۔ بے خبر نے منشی صاحب کی یہ درخواست قبول کرنے کے بعد غالب کو خطوط کی نقلوں کے باب میں لکھا اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر کر دیا کہ منشی ممتاز علی اپنے اہتمام سے ان کا ایک مجموعہ شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بے خبر کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:-

"حضرت! نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمایش سے مرتب ہو رہا ہے"[2]

یہ بھی خلاف واقع ہے کہ بے خبر نے خطوط کی جمع و ترتیب کا کام ۱۸۶۱ء میں شروع کیا اور ۱۸۶۵ء یا ۱۸۶۶ء میں ختم کر کے اپنے جمع کردہ خطوط منشی ممتاز علی خاں کے پاس بھیج دئے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مکاتیب کی جمع و ترتیب کا کام اتنے پہلے ختم ہو گیا تھا۔ اگر ۶۵ء یا ۶۶ء میں یہ کام انجام کو پہونچ جاتا تو خطوط کی اشاعت میں اتنی تاخیر نہ ہوتی۔

۶۱ء میں چودھری عبدالغفور کا مجموعہ مرتب ہوا۔ اگر یہ دوسرا مجموعہ ۶۵ء یا اس کے ایک سال بعد تکمیل کو پہونچ گیا تھا تو اس کی اشاعت پورے تین سال تک کھٹائی میں کیوں پڑی رہی۔[3]

اصل غلطی کی وجہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ پہلے ہی یہ فرض کر لیا گیا کہ بے خبر نے اپنے طور پر خطوط کا ایک مجموعہ طیار کیا تھا جس کی طبع و اشاعت

---

[1] عود ہندی نولکشور صفحہ ۱۳۲

[2] غبانِ بے خبر صفحہ ۸۲

[3] عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ بے خبر ۶۵ء میں جمع و ترتیب کا کام ختم کر چکے تھے۔ لیکن اس کی کوئی شہادت ان کے پاس نہیں۔ منشی مہیش پرشاد اس بات کے قایل ہیں کہ ترتیب کا کام ۶۶ء میں انجام کو پہونچا۔ اس کا وہ یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ بے خبر نے اپنے ایک خط میں مرزا کو لکھا تھا "الحمد للہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بندھوا کر آج ہی منشی ممتاز علی کی خدمت میں روانہ کر دی"۔ اس خط میں بے خبر نے "موید برہان" کا نام اور اس کا پتا دریافت کیا ہے۔ "موید" ۶۶ء میں شایع ہوئی۔ اس سے مہیش پرشاد صاحب نتیجہ نکالتے ہیں کہ عود کا نسخہ مکمل کر کے اگست ۶۶ء میں منشی ممتاز علی کی خدمت میں بھیجدیا گیا تھا۔ (ہندوستانی ۱۹۳۵ء صفحہ ۴۵۰) - یہ خیال و استدلال حسب ذیل وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہے۔

(۱) اس کا کیا ثبوت ہے کہ موید کی اشاعت کے بعد فوراً بے خبر نے اس کی بابت غالب سے استفسار کیا۔ جبکہ خود غالب کی نظر سے یہ کتاب قاطع القاطع کی اشاعت کے بعد ۶۸ء میں گزری۔ اور اسی لئے انھوں نے قاطع سے موخر سمجھ کر موید کے مصنف کو تیغ تیز کے دیباچے میں چوتھے نمبر پر۔ کھکر لکھا "رابعہم مدرس احمد علی صاحب"

(۲) اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس ترتیب کے بعد عود میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور یہ اس کی آخری ترتیب تھی۔

(۳) بے خبر کے اس خط سے جو منشی ممتاز علی کے نام ہے ظاہر ہوتا ہے کہ عود کا نسخہ سیدھا منشی صاحب کے پاس نہیں گیا وہ غالب کے پاس بھیجا گیا تھا تاکہ غازی الدین کی وساطت سے منشی صاحب کے پاس روانہ کر دیا جائے۔ کیا عود کی آخری ترتیب یہ تھی جو مذکورہ بالا ترتیب کے بعد اور اسکی اشاعت سے ذرا پہلے عمل میں آئی۔

کی وہ فکر میں تھے - حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے - بے خبر نے فراہمی مکاتیب کا کام منشی صاحب کے ایما و اشارے سے کیا اور یہ دونوں ۱۸۶۸ء تک اس کام میں لگے رہے اور اِدھر اُدھر سے خطوط کی نقلیں فراہم کرتے رہے - ۱۸۶۸ء میں جب یہ کام اختتام کو پہونچا تو کتاب پریس کو بھیجدی گئی جو عود ہندی کے نام سے مطبع مجتبائی میرٹھ سے طبع ہوکر شایع ہوئی - اس حقیقت کا اظہار خود منشی ممتاز علی خاں نے عود ہندی کے مقدمہ میں کیا ہے اور ان سے زیادہ معتبر اس واقعہ کا گواہ اور کون ہوسکتا ہے - وہ فرماتے ہیں :-

"مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں ..... مگر کلام اُردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی ..... حالانکہ نثر اُردو ان کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجے بہتر ہے ..... اسے بھی ترتیب دیجئے ..... مرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور، تخلص سے یہ ذکر آیا تو انھوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے سب کو ایک جا کرکے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ مجھے عنایت کیا - عرصہ تک سرگرم تلاش رہا - جا بجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہونچائیں - بڑی محنت اُٹھائی تب تمنا بر آئی اور مجموعہ مرتب ہوا - آج پورا اپنا مطلب ہوا - خواجہ غلام غوث صاحب بے خبر تخلص ..... میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب کے مخلص با اختصاص ہیں اس تلاش میں میرے معین و مددگار رہے، بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہونچا"

اس میں منشی صاحب نے صرف سرور کے مجموعے کا ذکر کیا ہے - باقی دوسرے مکاتیب کی فراہمی کو انھوں نے اپنی اور بے خبر کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ بتایا ہے - اگر بے خبر کے پاس خطوط کا کوئی مجموعہ تھا جو باقاعدہ ترتیب دئے جانے کے بعد ۶۵ء یا ۶۶ء میں منشی صاحب کے حوالہ کیا گیا تھا تو منشی صاحب کو ضرور اس کا ذکر کرنا چاہئے تھا اور اپنی تلاش اور محنت کا ذکر کرکے اس پر فخر و ابتہاج کا اظہار ہرگز ان کے لئے موزوں نہ تھا "مجموعہ مرتب ہوا آج پورا اپنا مطلب ہوا" ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عود کی ترتیب اس کے سال طباعت سے چند ماہ پہلے مکمل ہوئی اور اس سے پہلے جو اس کی اشاعت نہ ہوسکی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک جمع و ترتیب کا کام تکمیل کو نہ پہونچا تھا -

اس غلط فہمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب نے ۱۸۶۴ء کے بعد سے مجموعے کی طبع و اشاعت کا انتظار بڑی بے چینی سے شروع کردیا تھا - اس سلسلہ میں انھوں نے جو تقاضے بے خبر سے کئے ان میں منشی ممتاز علی کو ملزم ٹھہرایا - ۷ مارچ ۶۴ء کو بے خبر کے نام حسب ذیل خط لکھا :-

"اور ہاں حضرت ! کہئے منشی ممتاز علی کی سعی مشکور بھی ہوگی ؟ وہ مجموعہ اُردو چھپے گا یا چھپا ہی رہے گا"[1]

ایک اور خط میں لکھا :-

"اور ہاں حضرت ! وہ مجموعہ چھپے گا (بالفتح) یا چھپے گا (بالضم) چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجئے"[2]

اور آخر ناخوش ہوکر خطوط واپس طلب کئے :-

"اجی حضرت ! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں ؟ رقعے جمع کئے اور نہ چھپوائے ..... جانتا ہوں وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں - مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہونچے ہیں وہ سب یا ان سب کی نقلیں بطریق پارسل مجھ کو بھیجدیں"[3]

ان خطوط سے اہل علم کو شبہ ہوا کہ مجموعہ ترتیب پاکر منشی ممتاز علی کو بھیجا جا چکا تھا - طبع میں تاخیر منشی صاحب کی طرف سے تھی لیکن یہ کئی وجہ سے غلط ہے - عود کا نسخہ ۶۶ء میں مکمل ہوا - غالب نے اس کی چھپائی کا تقاضا ۶۴ء ہی میں شروع کردیا - اگر یہ تقاضا

---

[1] عود ہندی خط ۱۱۱ — [2] القیا خط ۱۱۲ — [3] القیا خط ۱۲۴

عود کی ترتیب کے بعد ہوا تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ وہ ۶۴ء میں مرتب ہو چکی تھی اور اس کے بعد جو تاخیر ہوئی اس کی ذمہ داری منشی ممتاز علی پر ہے۔ محض تقاضا اس امر کا ثبوت نہیں کہ کتاب اس سے پہلے تکمیل کو پہونچ چکی تھی اس لئے کہ غالب نے اپنے اوپر کے خط میں جہاں کتاب کی چھپائی کا تقاضا کیا ہے اور حق التصنیف کی جلدیں طلب کی ہیں وہاں نساخ کے نام کے ایک خط کی نقل بھی ملفوف ہے تاکہ مجموعہ میں شامل کر دی جائے۔

بات یہ ہے کہ مرزا کو جب اس کا علم ہوا کہ منشی ممتاز علی ان کے خطوط کی طبع و اشاعت کی فکر میں ہیں اور خاصی بڑی تعداد میں وہ خطوط فراہم کر چکے ہیں تو ان کے دل میں مطبوعہ خطوط دیکھنے کا شوق موجزن ہوا اور یہ ایک نفسیاتی بات ہے۔ انھیں منشی صاحب کی دقتوں کا علم نہ تھا۔ وہ اچھی طرح ان کی تجویز سے واقف نہ تھے۔ وہ سمجھے کہ چند خطوں کا مختصر مجموعہ شایع کیا جائے گا۔ اس لئے انھوں نے ۶۴ء سے یعنی بقول عرشی صاحب بے خبر کے مجموعہ کی ترتیب سے ایک سال پہلے اس کے طبع کا انتظار بلکہ تقاضا اور اصرار شروع کر دیا۔ اوپر جو غالب کے تین خط منقول ہوئے وہ قریب قریب اسی زمانہ کے ہیں۔ غالباً اس کے بعد بے خبر نے ان کو لکھا کہ خطوط کے ایک اچھے اور جامع قسم کے مجموعے کی اشاعت زیر غور ہے جس میں کافی وقت لگے گا اس لئے مرزا اس کے بعد خاموش ہو گئے اور پھر انھوں نے کوئی تقاضا نہ کیا۔ اس کا ایک قرینہ تو منشی صاحب کے وہ الفاظ ہیں جو اوپر مذکور ہوئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعے کی ترتیب اس کے چھاپے سے کچھ پہلے مکمل ہوئی۔ دوسرا قرینہ بے خبر اور شاکر کے نام کے دو خط ہیں (نمبر ۱۶۶ و ۱۶۷) جو ۱۲۸۲ھ کے بعد لکھے گئے اور جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ ایک تیسرا قرینہ جسے میں سب سے زیادہ واضح اور اس باب میں فیصلہ کن سمجھتا ہوں مرزا کا وہ خط ہے جو انھوں نے بے خبر کو ذکا اور شیفتہ کے خطوط کی نقل کے باب میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :-

"منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفےٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے۔ کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہونچے۔ کچھ بانٹے۔ کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام۔ یہ تحریر اس مفتے میں گئی ہے۔ غرض کہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے"[1]

اس خط کی تاریخ تحریر ۲۳ر جولائی ہے۔ سن مرقوم نہیں۔ منشی مہیش پرشاد ۱۸۶۶ء بتاتے ہیں[2]۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ اس لئے کہ اس میں اشرف الاخبار کے چھاپے کا ذکر ہے جو مارچ ۶۶ء اور جنوری ۶۷ء کے درمیان کسی تاریخ میں نکلا۔ اس کے علاوہ مولانا حالی کا شیفتہ سے تعلق ۱۸۶۳ء میں ہوا جب نواب صاحب جہانگیر آباد میں تھے۔ ۱۸۶۷ء تک مولانا حالی ان سے وابستہ رہے۔ غالب سے حالی کا تعارف اس زمانہ میں ہوا اور جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے شفتہ کے ساتھ انھوں نے بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا۔ لیکن اوپر کے رقعے میں مولانا حالی کو جس انداز سے سلام لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حالی کو غالب کی خدمت میں نہ صرف نیاز حاصل تھا بلکہ تعلقات بےتکلفی کا رنگ اختیار کر چکے تھے اور تکلف کی حدود سے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ اس لئے ۶۶ء یا اس کے بعد کا زمانہ حالی و غالب کے باہمی تعلق خاطر کی استواری کے پیش نظر زیادہ مناسب اور قرین صواب نظر آتا ہے۔ اگر بہ قیاس صحیح ہے تو یقیناً عود ہندی کے لئے خطوط کی نقلیں فراہم کرنے کا سلسلہ ۱۸۶۵ء تک جاری رہا اور خود بے خبر اس زمانہ تک منشی ممتاز علی کا اس اہم خدمت کی انجام دہی میں ہاتھ بٹاتے رہے

لیکن اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا رقعہ کے آخر میں غالب نے لکھا ہے :- "کیمس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال نے نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیجدیا۔ نثر کے باب میں تمھارا (بے خبر کا) نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے"

---

[1] عود ہندی خط ۱۶۱ — [2] رسالہ ہندوستانی ۳۵ء صفحہ ۲۵۲ (حاشیہ)

اگر مذکورۂ بالا رقعہ ۱۸۶۶ء میں لکھا گیا تو اس کا صاف و صریح مطلب یہ ہے کہ غالب کو اس وقت تک اس کا علم نہ تھا کہ یہ مجموعہ میرٹھ میں چھپے گا اور منشی ممتاز علی اس کے طابع اور ناشر ہوں گے۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے اور ابتدا ہی میں انھیں سب کچھ بتا دیا گیا تھا چنانچہ منشی ممتاز علی کا نام لے کر انھوں نے بے خبر سے پوچھا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور ان کی سعی مشکور ہوگی کہ نہیں ؟ یہ شبہ کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ غالب یہ سمجھے ہوں کہ مجموعہ الہ آباد میں طبع ہوگا لیکن اس کے جمع و ترتیب کا کام منشی ممتاز علی انجام دیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے کسی ذاتی مصلحت اور صلاح و دید کے پیش نظر منشی ممتاز علی کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ الہ آباد ایک بڑی اور اہم جگہ تھی اس کا نام لکھ دیا۔ بے خبر کا نام نہ لکھنے سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ غالب طابع و ناشر کا نام تو جانتے تھے لیکن مقام طباعت کا انھیں ٹھیک ٹھیک علم نہ تھا۔

بہر حال غالب کے اُردو خطوط کا یہ پہلا مجموعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو مرزا کی وفات سے چار ماہ پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ سے شایع ہوا۔ شروع میں منشی ممتاز علی خاں کا مختصر سا پیش لفظ اور سرور کا لکھا ہوا دیباچہ ہے اور آخر میں قلق میرٹھی اور ان کے شاگرد محو کے قطعات تاریخ کے علاوہ قلق کی لکھی ہوئی بھاری بھرکم اُردو نثر کی ایک تقریظ بھی ہے۔

(۳)

منشی ممتاز علی کا صرف یہی ایک کارنامہ نہیں۔ انھوں نے ایک اور اہم ادبی خدمت کا بیڑا اُٹھایا تھا لیکن بدقسمتی سے منشی صاحب کو اس میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مرزا غالب کے اُردو دیوان کے دو اڈیشن یکے بعد دیگرے ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء میں شایع ہو چکے تھے لیکن دونوں ناقص اور نامکمل تھے[1] منشی ممتاز علی نے مرزا کا ایک مکمل دیوان چھاپنا چاہا اور عظیم الدین کتب فروش میرٹھی کو اس کے طبع و اشاعت پر آمادہ کیا۔ خود غالب نے اپنے ایک خط میں، جو اپریل ۱۸۶۶ء کو شیو نراین کے نام لکھا گیا، اس کی پوری حقیقت بیان کی ہے۔ انھی کے الفاظ میں سنئے :-

"میاں دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سُن لو۔ تب کچھ کلام کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہونچا۔ سرنامے پر لکھا تھا۔ عرضداشت عظیم الدین احمد من مقام میرٹھ۔ واللہ باللہ اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہر حال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فایدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ خیر چھپ ہو رہا۔ جب میں رامپور سے میرٹھ آیا۔ بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں اُترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو ملے۔ انھوں نے کہا کہ اپنا اُردو دیوان مجھ کو بھیجدیجئے گا۔ عظیم الدین کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے ۔۔۔۔۔ اب جو منشی ممتاز علی نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی۔ کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیجدوں گا مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ میں ۔۔۔۔۔ دلی آکر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس بھیجدیا۔"[2]

بعض مصالح کی بنا پر غالب کو میرٹھ میں دیوان کا انطباع مطبوع خاطر نہ ہوا۔ دیوان مارچ ۶۰ء کے آخر میں میرٹھ بھیجا گیا۔ سکندر شاہ لے کر گئے۔ رسید ڈاک سے آئی۔ غالب، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :- "اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے کر گئے۔ مصطفےٰ خاں کو دے آئے، ڈاک میں اس کی رسید آگئی (اُردو صفحہ ۲۵۲) - اور اپریل میں غالب نے اس کی واپسی کے لئے نواب مصطفےٰ خاں کو لکھا ـــــ شیو نراین کو لکھتے ہیں :-

"آج اسی وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی وقت بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور ان کو لکھا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔"[3]

---

[1] منشی شیو نراین کو اپریل ۵۹ء میں لکھتے ہیں :- "اُردو کے دیوان کے چھاپے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں"۔ [2] اُردوئے معلی صفحہ ۲۸۶ - [3] اُردو صفحہ ۲۸۷

۱۱ر جون ۶۰ء تک دیوان واپس نہ ملا۔ ذیل کا خط سیاح کے نام ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :۔

" دیوان کا چھاپا کیسا۔ وہ شخص ناآشنا موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا تھا آدمی نہیں ہے۔ بھوت ہے۔ پلید ہے، غول ہے۔ قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر انطباع دیوان نامطبوع ہے، اب میں اس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آجائے۔ تم بھی دعا مانگو"۔[1]

یہ دعا بارگاہ الٰہی میں قبول ہوئی اور ابھی چند ہی روز گزرنے پائے تھے کہ مسودۂ دیوان غالب کے پاس پہونچ گیا۔ غالب نے خاص بروز عید مطابق ۳۰ر جون ۶۰ء یہ نوید سیاح کو پہونچائی :۔

" میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب نالنصاف سے ہاتھ آگیا اور میں نے نورچشم منشی شیونرائن کو بھیجدیا۔ یقین کلی ہے کہ وہ چھاپیں گے"۔[2]

عظیم الدین میرٹھی سے دیوان بزور و جبر منشی شیونرائن کی خاطر حاصل کیا گیا تھا اور جیسا کہ اس خط میں ہے اسی وقت بلا تاخیر منشی جی کو بھیجدیا گیا۔ لیکن اس کی طبع و اشاعت ان کی قسمت میں نہ تھی۔ یہ سعادت دہلی کے ایک اور مطبع احمدی واقع شاہدرہ کے حصہ میں آئی جہاں سے وہ ۲۹ر جولائی ۱۸۶۱ء میں چھپ کر شایع ہوا۔[3] غالب منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں :۔

" غور کرو۔ میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمہاری ناخوشی پر بجبر اس سے پھیر لیا"۔[4]

شوکت سبزواری

(باقی)

---

[1] الفیا ۱۹ — [2] الفیا صفحہ ۱۲ — [3] غالب سید بدرالدین حقیر کو لکھتے ہیں :۔ " دیوان اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصہ میں دلی اور کان پور میں دو جگہ چھاپا گیا"۔ اس خط میں تاریخ درج نہیں۔ مہر صاحب کا قیاس ہے کہ یہ ۱۰ر جنوری ۶۲ء سے پہلے کا ہے۔ یہ غلط ہے۔ غالب نے اس خط کے متن میں لکھا ہے۔ "۱۸۶۳ء یعنی سال گزشتہ میں قاطع برہان چھپی" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط ۶۳ء میں لکھا گیا۔ غالب نے دلی اور کانپور کی جن دو اشاعتوں کا ذکر اس خط میں کیا ہے کہ وہ یہی ۱۲۷۵ھ (۱۸۶۲ء) کی اشاعتیں ہیں۔ مہر صاحب ۱۸۵۹ء سے پہلے کی اشاعتیں بتاتے ہیں۔ یہ بھی غلط ہے (ملاحظہ فرمائیے غالب صفحہ ۲۹۷) — [4] اردو صفحہ ۲۸۹

"من و یزداں" (کامل)
کا
دوسرا اڈیشن
(رعایتی قیمت اخیر اپریل ۵۴ء تک)
اس کی قیمت معہ محصول نو روپیہ ہے، لیکن خریداران نگار اسے معہ محصول صرف سات روپیہ میں حاصل کر سکتے ہیں

شہوانیات
اور
شہاب کی سرگزشت
(رعایتی قیمت اخیر اپریل ۵۴ء تک)
ان دونوں کتابوں کی قیمت معہ محصول ۸ر ہے، لیکن دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول ۵ر میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

وحید الہ آبادی اور ان کے بعض تلامذہ

شاعر ہے داغ اور ہے استاد فن امیر
اکبر، وحید قبلۂ اہلِ کمال ہے،

(اکبر داناپوری)

شہرت کی بنیاد قسمت پر ہے اور اس کے مختلف اسباب بھی ہوتے ہیں۔ بعض ہستیاں جلیل القدر ہوتی ہیں اور خوش قسمتی سے انھیں زمانہ بھی ایسا مساعد ملتا ہے کہ زندگی ہی میں انھیں کافی شہرت اور مرنے کے بعد بھی بقائے دوام حاصل ہوجاتی ہے۔ بعض ہستیاں معمولی درجہ کی ہوتی ہیں لیکن حسن اتفاق اور خوش قسمتی سے ان کی بھی شہرت ہوجاتی ہے گو یہ شہرت عارضی ہوتی ہے دیرپا نہیں ہوتی۔ مگر بعض ہستیاں جلیل القدر ہونے کے باوجود مختلف اسباب سے کچھ اس طرح گوشۂ گمنامی میں پڑجاتی ہیں کہ بہت سے لوگ ان کے نام سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔ مولانا وحید الہ آبادی بھی اسی تیسری قسم کی ہستیوں میں ہیں، نہ اُردو شاعری میں ان کے مرتبہ کا صحیح تعین ہوسکا، نہ تاریخ شعراء میں انھیں جگہ مل سکی۔ حالی کے تذکرۂ شعرا گلِ رعنا میں ان کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے اور وہ بھی حاشیہ میں اور بہت مختصر۔ حالانکہ ان کی شاعرانہ شخصیت داغ و امیر اور ان کے معاصرین کی شخصیتوں سے ہرگز کم نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے اواخر اور چودھویں صدی ہجری کے عشرہ اول میں مولانا وحید کی شاعرانہ عظمت مسلم تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا مکمل دیوان شایع نہ ہوسکا، اور لوگوں نے انھیں بہت کم جانا۔ حالانکہ ان کے دو دیوان ایک مکمل اور دوسرا غیر مکمل ان کے وطن میں اب تک موجود ہیں۔ دونوں دیوانوں کا مختصر انتخاب انجمن ترقی اُردو سے ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا تھا اور اسے سید علی حسنین زیبا نے ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ کتنے جواہر ریزے دامن انتخاب میں نہ آسکے۔ اب یہ کتاب ناپید ہے اور انجمن کے دفتر میں نہیں ملتی۔

والد مرحوم حضرت حمد کاکوی کی بدولت میرے وطن قصبۂ کاکو (ضلع گیا) میں شعر و شاعری کا چرچا تھا، اب تو اللہ ہی اللہ ہے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو انھیں سے مولانا وحید کا نام نامی سُنا۔ انھیں وحید کے سیکڑوں اشعار یاد تھے اور ایک مرتبہ شاہ اکرام الدین صاحب عرفاں اسلامپوری کے پاس ان کی فرمائش سے انھوں نے وحید کے سیکڑوں اشعار بھیجدئے تھے۔ والد مرحوم نے ایک غزل یا سہرے پر مولانا وحید سے اصلاح بھی لی تھی۔ جب تعلیم کے سلسلہ میں میرا قیام عظیم آباد میں ہوا تو مولانا وحید کے متعدد تلامذہ سے میری ملاقاتیں ہوئیں اور ان بزرگوں سے مجھے انکے حالات اور اشعار سننے کا اکثر موقع ملا۔ افسوس ہے کہ کمسنی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان حالات اور اشعار کو قلم بند کرنے کا خیال نہ رہا ورنہ اس مقالہ کی ترتیب میں بہت مدد ملتی۔

نام و وطن مولانا وحید الہ آبادی کا نام وحید الدین احمد اور تخلص وحید تھا۔ ان کے والد مولوی امیر الدین عرف امراللہ الہ آباد میں وکالت کرتے تھے ضلع الہ آباد میں قصبۂ کڑا ایک مقام ہے، وہیں مولانا کا مسقط الراس تھا اور وہیں فارسی و عربی کی تعلیم پائی، اوائل عمر سے شوق شاعری دامنگیر ہوا۔

ولادت و وفات وحید الہ آبادی کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ تاریخ وفات معلوم ہے، جس سے ان کے زمانہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۳ء) میں ان کا انتقال ہوا۔ "ماتم آتش جاں سوز" اور "جائے پاکش برلب کوثر بود" مادہ ہائے تاریخ میں مولوی ابونصر کی تحریر سے جو انتخاب وحید میں درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا وحید کی عمر تقریباً ستر برس کی تھی لیکن اسی کتاب کے صفحہ ۳ پر ترسٹھ برس عمر بیان کی گئی ہے اور صفحہ ۱۱ پر مذکور ہے کہ "انتقال کے وقت عمر ترسٹھ سال کی تھی اور سنہ ارتحال ۱۸۹۲ء ہے اس حساب سے

سال پیدائش ۱۸۲۹ء قرار پاتا ہے"۔ ۱۸۲۹ء ۱۲۴۴ھ کے مطابق ہوتا ہے، اسی سال امیر مینائی کی پیدائش ہوئی تھی۔ غرض وحید الہ آبادی، امیر مینائی کے ہمسن اور داغ (۱۲۴۶ھ - ۱۳۲۲ھ) سے عمر میں دو سال بڑے تھے اور دونوں کے معاصر تھے۔

تلمذ مولانا وحید کو ابتدائے عمر ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ انھوں نے عربی و فارسی کی اچھی تعلیم پائی تھی۔ ان کے تلامذۂ عظیم آباد ہمیشہ انھیں "مولانا" کہا کرتے تھے اور احتراماً نام بھی نہیں لیتے تھے۔ انھیں کس شاعر سے تلمذ حاصل تھا یہ بات تحقیق طلب ہے۔ مولانا عبدالحئی گلِ رعنا میں فرماتے ہیں "مولوی وحید الدین کہن سال اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ مصحفی کا زمانہ انھوں نے پایا تھا اور اُن سے مشورۂ سخن کیا تھا"۔ مصنف نے یہ جملہ بغیر تحقیق کے لکھدیا ہے۔ مصحفی کا انتقال ۱۲۴۳ھ میں ہوا ہے اُس وقت وحید پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔ اگر وحید کی عمر ستر سال بھی قرار دیجائے اور تاریخ ولادت ۱۲۳۶ھ بھی فرض کی جائے تو ان کی عمر مصحفی کے انتقال کے وقت زیادہ سے زیادہ تین سال کی رہی ہوگی، اس لئے مصحفی سے تلمذ کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ والد مرحوم فرماتے تھے کہ وحید کو آتش (شاگرد مصحفی) سے تلمذ حاصل تھا۔ حضرت اکبر داناپوری کے دیوان اول موسوم بہ تجلیاتِ عشق سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ وحید، آتش کے شاگرد تھے۔ لیکن اس کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں۔ حضرت اکبر داناپوری کا بیان تحقیق پر نہیں بلکہ محض قیاس پر مبنی ہوگا۔ تجلیاتِ عشق میں شعر و شاعری کے متعلق ان کی ایک نظم ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی، معنی کے شاگرد تھے حالانکہ اس تخلص کا کوئی شاعر نہ تھا۔ اس دور میں ایک شاعر میر امانی ۱۸۸۱ء تک دہلی میں تھے اور مصحفی بارھویں صدی ہجری کے عشرۂ ہشتم میں دہلی پہونچے تھے ممکن ہے کہ انھوں نے امانی کو دیکھا ہو۔ دہلی میں ایک اور امانی تھے جن کا نام تک معلوم نہیں۔ ایک اور صاحب تھے جن کا نام میر امانی اور تخلص اسد تھا، یہ سودا کے شاگرد تھے اور مصحفی کے ہم عمر اور ان کے استاد ہونے کے لایق نہ تھے۔ اسی طرح تجلیاتِ عشق میں وحید کو آتش کا شاگرد قرار دینا محل نظر ہے بلکہ شواہد و قراین اس کے خلاف ہیں۔ آتش کا انتقال ۱۲۶۳ھ میں ہوا ہے۔ اُس وقت وحید کی عمر شاید بیس سال کی ہوگی، اس لئے آتش سے اصلاح لینے کا امکان تو ضرور موجود ہے لیکن قرائن اس کے خلاف ہیں۔ آخر عمر میں بیوی کے انتقال کے بعد آتش آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئے تھے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کا بیان ہے کہ آتش کے نوجوان بیٹے محمد علی جوش کی شادی ہوئی تو لوگ انھیں آتش کے پاس لائے، آتش چیخ مار کر رونے لگے، لوگوں نے سبب پوچھا تو کہا کہ اس کی ماں جو سہرے کے پھولوں کا تماشا دیکھ کر مسرور ہوتی رخصت ہوگئی میں بینائی سے محروم ہوں اب اس کا سہرا کون دیکھے"۔ پیرانہ سالی اور عدم بصارت کی حالت میں یہ تقریباً ناممکن نہیں تو مستبعد ضرور ہے کہ وحید نے آتش کی شاگردی اختیار کی ہو۔ بچپن کی ایک بات مجھے یاد ہے غریب خانہ پر ایک صحبت شعر و شاعری میں کسی نے سوال کیا کہ مولانا وحید کس کے شاگرد تھے۔ موضع انڈھوس کے ایک رئیس شاعر حافظ عبدالمجید مرحوم نے فرمایا کہ انھوں نے ابتدا میں آتش سے اصلاح لی تھی۔ حافظ عبدالمجید مرحوم نے وحید کے استاد کا نام بتانے میں کچھ غلطی کی، ان کا نام بشیر الدین نہیں بلکہ شیخ بشیر علی تھا، وہ قصبہ کڑا کے رئیس تھے، بشیر تخلص تھا، خواجہ آتش کے شاگرد تھے۔ خود وحید کے ایک شعر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

اب تم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہو　　فیض بشیر سے یاں کہئے تو کیا نہیں ہے،

اگر آتش سے دو ایک بار بھی اصلاح لی ہوتی تو وحید نے اپنی غزل کے کسی مقطع میں اس کی طرف اشارہ ضرور کیا ہوتا۔

کچھ اور حالات

مولانا وحید کا قیام کبھی کڑا میں اور کبھی الہ آباد میں رہتا تھا۔ وہ لکھنؤ اور حیدر آباد بھی تشریف لے گئے تھے۔ انتخاب وحید میں ایک دلچسپ واقعہ مذکور ہے۔ مولوی ابونصر کا بیان ہے کہ "ایک مرتبہ آپ کو لکھنؤ تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا۔ لکھنؤ میں ایک بیگم صاحبہ کے یہاں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ چونکہ آپ کو واپسی کی عجلت تھی اس وجہ سے شرکت مشاعرہ ناممکن تھی آپ کے ایک دوست آپ کو بیگم صاحبہ کے دولت خانہ پر لے گئے اور بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ یہ شاعر جو میرے ہمراہ ہیں گاؤں کے رہنے والے ہیں، چونکہ جلد واپس جانے والے ہیں، شرکت مشاعرہ میں نہیں کرسکتے اُن کا کلام سُن لیا جائے۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا مجھ کو کلام سننے کی فرصت نہیں ہے، ان کو ایک مصرع دیا جائے تاکہ دوسرا مصرعہ ضم کریں، میں ان کے کلام کا اندازہ کرلوں گی۔ چنانچہ یہ مصرع سنایا گیا

ے "دور سے آئے ہیں مشتاق تماشا ہوکر۔" آپ نے برجستہ دوسرا مصرعہ کہکر شعر پورا کردیا:۔

دور سے آئے ہیں مشتاق تماشا ہوکر ہم سے پردہ نہ کرو شاہدِ رعنا ہوکر

مصرع سننا تھا کہ بیگم صاحبہ نے بے محابا پردہ الٹ دیا اور کلام سننے کی مشتاق ہوئیں، کلام سن کر بیحد مسرور ہوئیں، لکھنؤ میں بھی آپ شہرت ہوگئی۔"

مرقع سخن، مرتبہ صفدر مرزا پوری میں بھی ایک نہایت ہی دلچسپ لطیفہ مذکور ہے۔ لکھنؤ میں وحید شام کے وقت چوک سے گزر رہے تھے ایک کوٹھے پر ایک حسین طوائف خربزہ تراش رہی تھی، وحید نے یہ سین دیکھکر یہ شعر برجستہ موزوں کیا اور طوائف کو مخاطب کرکے زور سے پڑھا

مصروف ہیں جو آپ بنانے میں قاش کے رکھ لیجئے گا دل بھی ہمارا تراش کے

طوائف شعر سن کر مسکرانے لگی اور وحید کو کوٹھے پر بلاکر خربزے کی دعوت کی

یہ غالباً بادۂ شباب کی سرمستی تھی۔ اشعار سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا وحید کی جوانی رنگین گزری تھی اور انھوں نے عشق و محبت کے تلخ و شیریں تجربات حاصل کئے تھے۔ اس سلسلہ کے کچھ اشعار سن لیجئے:۔

عجب عشرت تھی جب تک تھی جوانی وہ باتیں ہوگئیں اب سب کہانی

کچھ اس کا مزہ جانتا ہے دل ہی ہمارا لاتی ہیں ترے دل کا جو پیغام نگاہیں

یہ لطف بھی اُٹھا چکے کچھ دن کسی کے ساتھ اب دل میں حوصلہ ہی نہیں رسم و راہ کا

تمام خلق کو اب بے وفا سمجھنے لگے طبیعت اُن سے پھری تو خراب ہوکے پھری

سید شاہ محمد مبارک حسین مبارک عظیم آبادی رئیس پٹنہ فرماتے تھے کہ مولانا کی طبیعت کا انداز ہمیشہ والہانہ رہا۔ اکثر شام کو پٹنہ سٹی کے خنگل تالاب کے کنارے گھاس پر تنہا بیٹھے رہتے، پانی کی موجوں اور خوشگوار ہوا کا لطف اُٹھاتے اور اشعار لکھا کرتے۔ سر کے بال اُلجھے رہتے تھے اور اچکن کے بوتام کچھ ٹوٹے اور کچھ کھلے رہتے تھے۔ مشاعروں میں غزلیں بڑے جوش و خروش سے پڑھتے۔ ایک مشاعرہ میں اشعار پڑھتے پڑھتے اتنے بیخود ہوگئے اور بات کو ایسی جنبش دی کہ بیاض اُچھل کر کمرے کی چھت تک پہونچ گئی۔

عالمِ پیری میں عشق نے مجاز سے حقیقت کی طرف رجوع کیا اور وحید اذکار و اشغال میں مصروف رہنے لگے اور ریاضت و مجاہدہ کرنے لگے۔ اس واقعہ کی طرف ایک مطلع میں انھوں نے نہایت دل آویز انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

نظر نہ جائے گی اب اپنی ماسوا کی طرف خراب ہوکے بہت آئے ہیں خدا کی طرف

سانحۂ ارتحال مولانا وحید کے انتقال کا واقعہ بھی عجیب و غریب اور دلچسپ ہے۔ ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۸۹۲ء کو مولانا اپنے احباب کو افطار صوم کے لئے مدعو کر آئے تھے۔ اُس روز کسی بات پر "اپنے گھر میں کچھ ناخوش ہوئے اور غصے کی حالت میں فرمایا کہ" میرا جہاز طیار ہے میں دو گھنٹے میں چلا جاؤں گا تم لوگ کفِ افسوس مل کر رہ جاؤ گے۔" دوپہر کے وقت قصبہ کے چودھری محمد تقی کے مکان میں آگ لگی، ہوا تیز تھی آگ پھیلتی گئی۔ شور و غل سے مولانا نیند سے بیدار ہوئے اور زنانہ مکان میں جاکر مستورات کو مکان کے عقب میں پناہ دی اور ساری عمر کی کمائی دیوان نکالنے کے لئے ایک کوٹھری میں تشریف لے گئے۔ ان کا مکان بھی آگ کی لپیٹ میں آگیا، کوٹھری میں دھواں بھر جانے سے راستہ نہ مل سکا۔ آگ بجھنے کے بعد لوگ کوٹھری میں گئے تو عجیب تماشا دیکھا کہ مولانا ایک مونڈھے پر رو بہ قبلہ بیٹھے ہیں، گود میں دیوان ہے، اور روح پرواز کرچکی ہے۔ اس واقعہ کو میں بچپن میں سن چکا تھا، انتخاب وحید کے مطالعہ سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی، مولوی ابونصر کی تحریر مندرجہ مقدمہ انتخاب وحید میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

ورود عظیم آباد عظیم آباد پٹنہ کے رئیس اعظم خان بہادر میر ابوسعید نے مولانا وحید کو طلب فرمایا۔ آپ پٹنہ تشریف لائے تو وہاں کے بہت سے رؤسا و امرا آپ کے شاگرد ہوگئے۔ مولانا کا قیام عظیم آباد میں اکثر رہا ہے اور یہاں کی شاعری آپ کی

شخصیت سے بہت متاثر رہی ہے۔ اُس دور میں شاعروں کی تین پارٹیاں تھیں پہلی پارٹی مولانا وحید اور ان کے تلامذہ کی تھی، دوسری پارٹی صفیر بلگرامی اور ان کے تلامذہ کی، تیسری شاد عظیم آبادی اور ان کے شاگردوں کی، اُس زمانہ میں عظیم آباد شعر و سخن کا مرجع تھا، شعرا کی کثرت تھی، برابر مشاعرے ہوا کرتے اور تینوں پارٹیاں شریک ہوتیں۔ گلدستے نکلتے تھے جن میں سب کی غزلیں شایع ہوئی تھیں۔ شاہ مبارک عظیم آبادی فرماتے تھے کہ ریاست حیدر آباد سے مولانا کو طلب کیا گیا تھا۔ اگر وہ تشریف لے جاکر وہاں قیام کرتے تو غالباً داغ کے دوش بدوش انھیں جگہ ملتی، لیکن شاگردان عظیم آباد نے انھیں حیدر آباد جانے سے باز رکھا۔ مولانا وحید بھی پٹنہ کے کچھ ایسے گرویدہ تھے کہ انھوں نے شاگردوں کی محبت پر حیدر آبادی قدردانیوں کو نثار کردیا۔ صرف ایک بار حیدر آباد کے سفر کی نوبت آئی تھی جس کے کچھ اشارے ایک غزل میں پائے جاتے ہیں جس کی ردیف و قافیہ کا لاپہاڑ ہے۔ اس غزل کے صرف دو شعر انتخاب میں درج ہیں :-

سیر و سفر اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا وحید سیر و سفر کے بڑے شایق تھے اور اس میں انھیں بڑا لطف ملتا تھا مستقل قیام تو کٹڑا اور کبھی الہ آباد میں رہتا تھا لیکن لکھنؤ اور خصوصاً عظیم آباد تو گھر آنگن تھا۔ سیر و سفر کے مضامین ان کے دیوان میں بہ کثرت موجود ہیں، یہ اشعار رسمی و تقلیدی نہیں بلکہ فطری اور نفس الامری ہیں۔ غالباً کسی اور شاعر نے سیر و سفر کے مضامین اس کثرت اور اس دلکشی کے ساتھ بیان نہیں کئے۔ ملاحظہ ہوں ؎

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اُداس — کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو
اے جنوں تنگ ہوئی وسعت صحرا تجھ سے — اب کہاں جائے طبیعت کوئی بہلانے کو
میں نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

جو ہیں پاؤں میں آبلے ان سے پوچھو، — ہمیں کیا خبر کس بیاباں میں ہم تھے

گو وطن پہونچے ہوئے ایک زمانہ گزرا — ابھی آنکھوں ہی میں ہے اپنے سفر کی صورت

کس طرح لیجاؤں دل کو شہر کی جانب وحید — اپنی قسمت میں تو اب صحرا لکھا ہے یا پہاڑ،

نہ تھی عزم غربت سے پہلے خبر — کہ دلوائے گی خون یاد وطن

وحید کا تغزل مولانا وحید وہبی و فطری شاعر تھے اور بڑے پرگو۔ لمبی لمبی غزلیں لکھتے اور اچھے اچھے اشعار نکالتے، نئی نئی زمین نکالتے اور مشکل مشکل طرحوں میں بہت اچھے اشعار نکالتے۔ چند اشعار سے اس خیال کی تصدیق ہوگی ؎

جو اُن کو منظور ہر طرح تھا کہ مجھ پر ظاہر ملال دل ہو — نظر نہ کی میں نے چشم تر پر تو رخ پہ آنسو بہا کے مارا
جہاں سے کچھ ان کا سامنا تھا جہاں وہ پردے میں جلوہ گر تھے — وہیں سے چلمن اُٹھا کے مارا نہ جا کے مارا نہ آلے مارا

میں نے بہت کہا کہ یہ خنجر خراب ہے — اس پر گلے لگائے وہ قاتل تو کیا کروں

عالم وحشت میں صحرا خوب ہے — اے جنوں تکلیف زنداں کی نہ دے
آگ سینے کی بھڑک اُٹھے گی اور — اب ہوا للہ داماں کی نہ دے

تقدیر بگڑتی ہے تو کچھ بن نہیں پڑتی — سچ کہتے ہیں پڑتی ہے تو کچھ بن نہیں پڑتی
رہ جاتا ہے منہ دیکھ کے دل تھام کے انساں — آنکھ آپ سے لڑتی ہے تو کچھ بن نہیں پڑتی

حسرت ابھی نظارۂ قاتل کی دل میں ہے — بسمل تو ہو چکا ہوں مگر دل کی دل میں ہے

ایک جہاں ہے ظلم رسیدہ کس کی کہئے کس کی سنئے — کون نہیں ہے آفت دیدہ کس کی کہئے کس کی سنئے
دیکھتے تھے کل جن کو جہاں میں آج وہی افسانہ ہوئے ہیں — قصۂ دیدہ اب ہے شنیدہ کس کی کہئے کس کی سنئے

مرا خیال تھا یا میں ہی اُن کے سامنے تھا — یہ مجھ کو کچھ نہیں معلوم کیوں وہ آکے ہٹے

بلا سے مر گئے یا خاک ہو گئے اے دل قدم تو معرکۂ عشق میں نہ آگے بڑھے،
در گزرے خلد سے ترے در کی زمیں تو ہے شکر اس کا ہے کہ اپنا ٹھکانا کہیں تو ہے
اگر ہے یاد چمن عندلیب کو کچھ بھی قفس میں چین نہ ہوگا غریب کو کچھ بھی
میں کب سے پوچھ رہا ہوں شراب ہے کہ نہیں مرے سوال کا ساقی جواب ہے کہ نہیں
صحرا کے خار خشک زمانے میں ہیں نہال گلشن کے نخل حسن نمو پا کے مست ہیں
جب زخم تھا تو اُس سے تھا روح کو سرور اب چاک دل پہ اپنے رفو پا کے مست ہیں
پہلے سے ارادہ ہم تو کبھی کرتے نہیں اب جائیں گے کہاں تقدیر میں جب ہوتا ہے سفر لے جاتا ہے مقسوم ایک طرف
آنکھوں سے مقابلہ ہے دل کا کیا فیصلہ ہوتا ہے دیکھیں دو سحر کے حاکم ایک طرف سوناز کا محکوم ایک طرف

وحید الہ آبادی دماغ سے نہیں بلکہ دل سے شعر کہتے تھے۔ ان کے اشعار ان کے جذبات و واردات کے آئینہ ہیں انھوں نے غزلوں کے سوا کچھ نہیں کہا۔ ان کی طبیعت تغزل ہی کے لئے مناسب واقع ہوئی تھی اور اسکے جو شرائط درکار ہیں یعنی عزلت نشینی، قناعت پسندی آزاد مزاجی اور وسیع المشربی، درد مندی، دل سوزی اور جانگدازی یہ سب صفتیں مولانا وحید کی طبیعت میں موجود تھیں۔ ان کی غزلوں میں لکھنؤ کی خارجیت نہیں بلکہ دہلی کی داخلیت پائی جاتی ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف و سلیس ہے۔ انداز بیان میں شیرینی اور دل آویزی ہے، یہی وجہ ہے کہ اشعار میں تاثیر ہے۔ کلام دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں دو ہی قسم کے رنگ سے شغف تھا عاشقانہ اور صوفیانہ۔ کچھ عاشقانہ اشعار ملاحظہ ہوں :-

کچھ کہہ کے اس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا
کس طرح کاٹئے سا دن کی اندھیری راتیں اب تو دل سوز نہیں شمع بھی جگنو کے سوا
یہ نہ پوچھو کہ محبت نے دکھایا کیا کیا کچھ جواب اس کا نہیں آنکھوں میں آنسو کے سوا
حسرتیں جی کی اپنے جی سے کہوں دل کے صدموں کو کیا کسی سے کہوں،
ہم پر تو جو کچھ گزری گزری غم فرقت میں کیا جانے وہاں تم پر کیا ہوگی محبت میں
یہ جب آنکھ اُن سے لڑی نہ تھی تو یہ آنسوؤں کی جھڑی نہ تھی کوئی دل میں پھانس گڑی نہ تھی کوئی رات اتنی بڑی نہ تھی
کیا پوچھتے ہو اب کے جو دل پر لگی ہے چوٹ ایسا نہ درد ہوتا تھا اکثر لگی ہے چوٹ
وہ آہ لب پہ نہیں دل میں سوز غم بھی نہیں تم اور ہو گئے جس روز سے وہ ہم بھی نہیں
جس پہ ہے نظر اپنی نظر میں بھی وہی ہے اشکوں میں وہی دیدۂ تر میں بھی وہی ہے
وہ مجھ سے کہتے ہیں تری آہیں غضب کی ہیں اس کی خبر نہیں کہ نگاہیں غضب کی ہیں

اب کچھ صوفیانہ اشعار بھی سن لیجئے ؎

منزل کا شوق آپ ترا ہوگا رہنما چلنا جو ہو تو پھر نہ پتہ پوچھ راہ کا
کیا میکدہ ہے عشق حقیقت میں یار کا بیخود کا جو ہے حال وہی ہوشیار کا
کیا محو عشق ہوں مجھے اتنی خبر نہیں فرقت کی شب ہے روز ہے یا وصل یار کا
ہر شکل کا شیدا ہوں میں دیوانہ ہوں کس کا ہر شمع پہ سوزاں ہوں میں افسانہ ہوں کس کا
ہوتا ہے جہاں دیکھئے میرا وہیں مذکور، مشہور زمانہ ہوں میں افسانہ ہوں کس کا
عشق کی راہ سے مسلک ہے جو دونوں کا جدا پھر تو کافر ہے نہ تیرا نہ مسلماں تیرا

یہ سوئے دیر و حرم کیوں گئے برہمن و شیخ — خیال یار میں آنکھوں کو بند کیوں نہ کیا

اُسے تو آپ ہی میں ڈھونڈھ اگر لے دل طلب کچھ ہے — اسی انساں میں سب کچھ تھا اسی انساں میں سب کچھ ہے

کسی کا رنگ ترے رنگ سے نہیں باہر — بہار اپنی ہی صورت کی خوب زشت میں دیکھ

حرم میں جس کے میں جلوے کا دل سے طالب ہوں — وہ کہہ رہا ہے تماشا مرا کنشت میں دیکھ

دیر و حرم کو سمجھے ہیں سب آستانِ یار — ہم سے جو پوچھئے تو مکاں ہے نہ یہ نہ وہ،

جب اُس کے سوا اپنی نگاہوں میں نہیں کچھ — نزدیک ہمارے نہ مکاں کچھ نہ مکیں کچھ

اُدھر آئینہ رکھا ہے ادھر وہ تن کے بیٹھے ہیں — جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

آخر الذکر شعر کو ایک گونہ تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ ۱۲۹۹ھ (م ۱۸۸۱ء) میں مرزا داغ کانپور، الہ آباد، لکھنؤ ہوتے ہوئے رامپور سے عظیم آباد آئے تھے اور یہاں تقریباً ایک ماہ مولانا وحید کے شاگرد منشی سید محمد باقر کے ہاں قیام کیا تھا۔ میر باقر نے اپنے استاد کا یہی مطلع سنایا تو داغ نے بہت تعریف کی۔ داغ کے اعزاز میں جو پہلا مشاعرہ یہاں منعقد ہوا اس کے لئے یہی زمین چنی گئی۔ داغ نے بھی غزل لکھی جس کا مطلع اور مقطع یہ ہے :-

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں، — کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

کوئی چھیڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں — عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

مولانا وحید کی طبیعت فلسفیانہ واقع ہوئی تھی۔ وہ کہیں کہیں فلسفانہ تصورات اور نفسی کیفیات کی تصویر کشی بھی بڑے دلکش انداز میں کر دیتے ہیں۔ لیکن طرز ادا میں وہی سادگی، شگفتگی اور شادابی پائی جاتی ہے جو ان کی طبیعت کا جوہر ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

رات کو دن کی کہ دن کو رات کی حسرت کرے — آدمی دنیا میں کس کس بات کی حسرت کرے

اس میکدے میں کتنے سبو پاکے مست ہیں، — کتنے فقط شراب کی بو پاکے مست ہیں

معطر ہے اُسی کوچے کی صورت اپنا صحرا بھی — کہاں کھولے ہیں گیسو بار نے خوشبو کہاں تک ہے

رکھتے نہ ادھر پاؤں تو مشکل تھا پہونچنا — منزل کا پتہ راہ خطرناک سے پایا

ایک بیخود سے جدا ہے دوسرے بیخود کا رنگ — اپنے اپنے رنگ میں جلوہ ہے ہر تصویر کا

قفس سے اُلفتِ صیاد اُڑنے ہی نہیں دیتی — اگرچہ طاقتِ پرواز بھی بازو میں پاتا ہوں

چمن سے جائیں گے پھر خاک اُڑانے صحرا میں — ذرا بہار کا رنگ اپنے سال دیکھ تو لیں،

نسریں میں ہے نہ آگ نہ ہے نسترن میں آگ — دل ہے جلا ہوا تو ہے سارے چمن میں آگ

حالِ دل بھی اُن سے کہہ سکتا نہیں، — اپنی مجبوری کی حالت کیا کہوں،

دل پہ گزری ہوئی باتوں کا ہے کچھ اور اثر — اب نہ پہلے کی طبیعت کسی افسانے سے

وہاں بھی دل نہ سنبھالا گیا چلے آئے — گئے تھے دوڑ کے بے اختیار صحرا میں

ہزاروں پردوں میں روشن ہیں مثل جلوۂ مہر — نہ چھپ سکیں گے کبھی پردۂ غبار میں ہم

کہا عمر بھر ہم نے دل کا فسانہ — کبھی آخر داستاں تک نہ پہونچے

ان اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا وحید کس قدر خوش بیان شاعر تھے اور انھیں خیال کو زبان سے ہم آہنگ کرنے کی کتنی قدرت حاصل تھی۔ اپنے شاعرانہ کمال کا خود انھیں احساس تھا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ہے ختم وحید خوش بیانی — قایل ہوں میں تیری گفتگو کا

اُن کے اشعار میں سوز و گداز اور فرطِ تاثر کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ان کی طبیعت چوٹ کھائی ہوئی تھی اور ان کا دل سوز و درد کا آشنکدہ تھا

اشعار میں ہے چوٹ طبیعت کی بھی لازم　　دل سب کا دکھا دیتی ہے آوازِ حزیں کی

مولانا وحید کے چند ایسے اشعار بھی مجھے یاد ہیں جو انتخاب وحید میں درج نہیں۔ ان میں سے چار پانچ اشعار مختلف موقعوں پر اس مقالہ میں درج کر چکا ہوں، بقیہ اشعار بھی درج کئے دیتا ہوں تاکہ ضایع ہونے سے بچ جائیں ؎

اُس حورلقا سے ملنے کا جب وصل کی شب سامان کیا　　آئینۂ صبح کو دکھلا کر گردوں نے مجھے حیران کیا
گرداب الم سے کشتی دل پہونچی بھی نہ تھی ساحل پہ ابھی　　اشکوں نے نکل کر آنکھوں سے اک اور بپا طوفان کیا
ہم جس کے لئے جاں سے گزرے اُسکو تو خبر کچھ بھی نہ ہوئی　　کہئے تو وحید اپنے جی کا بے فایدہ کیوں نقصان کیا

نظر جو دور تری جلوہ گاہ سے بھی گئی　　بھٹک گئی وہ کچھ ایسی کہ راہ سے بھی گئی

دُنیا ہوئی اندھیر بس اب جاتے کیا ہو　　کچھ فرض یہی ہے کہ قیامت ہی بپا ہو

دیکھا ہے نظر بھر کے جو محفل میں کسی نے　　کیا خوب جگہ کی ہے مرے دل میں کسی نے

شہیدِ ناز او قاتل ہمیں ہیں　　ترے انداز کے بسمل ہمیں ہیں
ہمارا ہی یہ ہے دونوں جگہ نور　　چراغ خانۂ و محفل ہمیں ہیں

وحید اتنی ہوس ہے قتل کے بعد　　نہ چھوٹے ہاتھ سے دامن کسی کا

اگر عظیم آباد کے مشاعروں کے قدیم گلدستے دستیاب ہوں تو اُن میں بھی وحید کی بہت سی غزلیں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ مولانا وحید بڑے پرگو شاعر تھے اور ہر زمین میں دو غزلہ سہ غزلہ لکھ جاتے تھے اور حیرت یہ ہے کہ اچھے اچھے شعر نکالتے تھے۔ اور بہت سی غزلیں جو انھوں نے عظیم آباد میں کہی تھیں یہیں رہ گئیں اور ان کے دیوان میں درج نہ ہوسکیں۔ مختصر یہ کہ مولانا وحید کا پایہ اُردو شاعری میں بہت بلند ہے وہ قدر اول کے شاعر تھے اور ان کے مکمل دیوان کی عدم اشاعت اُردو شاعری کی تاریخ کے لئے ایک ناقابلِ تلافی فروگزاشت ہے۔

مولانا وحید کے تلامذہ کثرت سے تھے۔ یو پی میں ان کے کون کون تلامذہ تھے مجھے خبر نہیں، صرف دو شاگردوں کا نام مجھے معلوم ہے۔ عظیم آباد میں بھی ان کے متعدد تلامذہ تھے۔ اب میں ان تلامذہ کا کچھ تذکرہ کرتا ہوں۔

(۱) اکبر الہ آبادی ۔ اکبر الہ آبادی (۱۲۶۲ - ۱۳۴۰ھ) نے حضرت وحید سے ابتدائے مشق میں اصلاح لی تھی۔ جناب زیبا انتخاب وحید میں لکھتے ہیں "مشہور ہے کہ اکبر الہ آبادی بھی انھیں کے شاگرد تھے"۔ گل رعنا میں بھی اُن کو وحید کا شاگرد بیان کیا گیا ہے۔ خود اکبر الہ آبادی کے ایک شعر سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

استادی وحید میں جس کو کہ شک ہو کچھ　　طیار اُس سے بحث کو اکبر ہے آج کل

حضرت اکبر داناپوری کی ایک رباعی سے بھی جو ان کے دیوان دوم جذبات اکبر میں موجود ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے ؎

شاگرد وحید کے ہیں دونوں اکبر　　ہم مشق بھی ہم دونوں رہے ہیں اکثر

لیکن قسمت کا صاد ان پر ہی ہوا　　پتھر پتھر ہے اور جوہر جوہر

شاہ مبارک مرحوم عظیم آبادی فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ اکبر الہ آبادی حضرت وحید کے ساتھ پٹنہ آئے تھے اور مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی تھی جس کا مطلع ہے ؎

سمجھے وہی اس کو جو ہے دیوانہ کسی کا　　اکبر یہ غزل میری ہے افسانہ کسی کا

شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اکبر الہ آبادی کے اسلاف صوبۂ بہار سے وابستہ تھے۔ سید محمد زماں رضوی نے جو اکبر لے

پردادا اللہ فوج بنگالہ میں صوبہ دار تھے لارڈ کلائو کے ساتھ جنگ پلاسی میں شرکت کی تھی۔ جب یہ جنگ فتح ہوگئی تو اس کے صلہ میں انکو داؤدنگر (ضلع گیا سوبۂ بہار) کے قریب ایک جاگیر ملی۔ زماں رضوی کے بڑے لڑکے سید فضل محمد رئیس داؤدنگر سے لکھنؤ اور پھر کانپور چلے گئے۔ وہاں انھوں نے عہدۂ نظارت قبول کیا اور ۱۲۷۲ھ میں رحلت کی۔ سید فضل محمد کے تین لڑکے تھے، سید وارث علی، سید واصل علی اور سید تفضل حسین۔ سید تفضل حسین کے دو صاحبزادے تھے، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی اور سید اکبر حسن۔ مولانا سید تفضل حسین اور اکبر الہ آبادی دونوں کو حضرت مولانا سید شاہ محمد قاسم دانا پوری سے بیعت حاصل تھی جن کا انتقال ۱۷ شوال ۱۲۸۱ھ کو ہوا۔ آپ کا مزار منیر شریف (ضلع پٹنہ) کی درگاہ کے احاطہ میں ہے، میں کئی مرتبہ فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا ہوں۔ حضرت اکبر دانا پوری آپ کے حقیقی برادر زادہ اور مرید و خلیفہ تھے۔ اکبر الہ آبادی کے عاشقانہ، صوفیانہ اور فلسفیانہ اور خاصکر مزاحیہ و طنزیہ و اصلاحیہ اشعار اتنے مشہور ہیں کہ نمونۂ کلام درج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

(۲) بینظیر شاہ — بے نظیر شاہ وارثی حضرت حاجی شاہ وارث علی کے مرید و خلیفہ اور مولانا وحید کے شاگرد تھے۔ نگار کے داغ نمبر ۱۹۵۳ء میں پروفیسر نفیس سندیلوی نے اپنے مضمون بعنوان "داغ اور ان کے معاصرین" میں بینظیر شاہ کو امیر مینائی کا شاگرد لکھا ہے، ممکن ہے دونوں سے اصلاح لی ہو۔ بینظیر شاہ نے مثنوی بدر منیر کے طرز پر اور اسی بحر میں ایک مثنوی بڑی اچھی لکھی ہے۔ ان کے تغزل کا رنگ یہ تھا:-

یہ مانا کوئی حد ہوس کی نہیں — محبت مگر اپنے بس کی نہیں
کوئی رہ گیا ہے پس کاروان — یہ نالے صدائیں جرس کی نہیں
مرے بال پرواز ٹوٹے ضرور — مگر تیلیاں تو قفس کی نہیں
نہ ٹوٹے گی مر کر بھی یہ قیدِ عشق — یہ زنجیر تارِ نفس کی نہیں
یہ دنیا نہیں قابلِ اعتبار — اگر ایک کی ہے تو دس کی نہیں
بڑی شے ہے واعظ کی ریشِ دراز — یہ ٹٹی کوئی خار و خس کی نہیں
ازل سے کسی کا ہوں میں بینظیر — یہ الفت برس دو برس کی نہیں

(۳) اکبر دانا پوری — سید شاہ محمد اکبر ابو العلائی دانا پوری خلف سید شاہ محمد سجاد ابو العلائی (۱۲۳۱ - ۹۸ ۱۲ھ) بہ مقام دانا پور محلہ شاہ ٹولی ۱۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد خانقاہ دانا پور کے سجادہ پر بیٹھے آپ نے مولانا وحید کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

حضرت اکبر نے ۱۳۲۶ھ میں وفات پائی اور متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، نثر میں پچیس تیس کتابیں تصنیف کیں مثلاً سر مینائی دل، ارادہ، ادراک وغیرہ۔ نظم میں دو دیوان ہیں، تجلیات عشق مطبوعہ ۱۳۱۴ھ اور جذبات اکبر مطبوعہ ۱۳۲۹ھ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

بزم ہستی میں ابھی آکے تو ہم بیٹھے تھے — یوں اجل آئی کہ زانو بھی بدلنے نہ دیا

اُنہی کی پھر گئیں آنکھیں مٹے ہیں ہم جن پر — خرابیِ دلِ خانہ خراب دیکھے کون

اب تو قفس ہی خوب ہو جاتے ہیں اس چمن سے ہم — جورِ خزاں اُٹھائے کون لطفِ بہار دیکھ کر

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی — دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

(۴) باقر عظیم آبادی — منشی سید محمد باقر باقر عظیم آبادی (متوفی ۱۹۲۷ء) فن خوش نویسی میں ماہر تھے، زمانۂ شباب میں موسیقی کی طرف رغبت تھی اور ستار اچھا بجاتے تھے۔ شطرنج بھی بہت اچھی کھیلتے تھے۔ مولانا وحید کے شاگرد تھے۔ ایک مثنوی کیمیائے دل اور ایک دیوان غزلیات موسوم بہ سرمایۂ عشق ان کی یادگار ہے۔

مرزا شاغل دہلوی برادر اخیافی مرزا داغ سے اور ان سے مراسم ہو گئے تھے کیونکہ حضرت باقر کو شاعری کے علاوہ شطرنج اور موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ اسی سلسلہ میں شاغل نے کچھ دنوں پٹنہ میں قیام کیا۔ ۱۲۹۹ھ (م ۱۸۸۱ء) میں مرزا داغ رام پور سے کلکتہ روانہ ہوئے تو مرزا شاغل ہی کے اصرار سے عظیم آباد بھی پہونچے اور تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔ حضرت باقر کے مہمان رہے۔

باقر عظیم آبادی کے کچھ اشعار جو مجھے یاد ہیں سن لیجئے ؎

دیکھ کر رنگ جہاں جی ہی مرا چھوٹ گیا — باقر اک میں ہوں اور اک گوشۂ تنہائی ہے

کچھ حال غریبوں کی مصیبت کا نہ پوچھو — ہر بات پہ رو دیتے ہیں غربت بھی ہے کیا چیز

باقر ہوئے اس شکل سے ہم یار کے ہمرنگ — عقدہ یہ کسی پر نہ کھلا ہم ہیں کہ وہ ہیں

(۵) مبارک عظیم آبادی ۔ پٹنہ میں اس نام و تخلص کے دو شاعر تھے۔ ایک تو سید شاہ مبارک حسین مبارک رئیس لودیکٹرہ پٹنہ سٹی جن کا نام اس مقالے کے گزشتہ صفحوں میں کئی جگہ آچکا ہے، دوسرے ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی جو داغ کے شاگرد ہیں اور اب تک بقید حیات ہیں۔ شاہ مبارک عظیم آبادی ۱۲۶۹ھ میں پیدا ہوئے، آپ کا آبائی وطن قصبہ کاکو ضلع گیا تھا۔ آپ کو مولانا وحید سے تلمذ تھا۔ طبیعت شاعرانہ تھی، آخر عمر میں قویٰ بہت مضمحل ہو گئے تھے اور موتیا بند کی وجہ سے بینائی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ لیکن داغ آخر وقت تک کام کرتا رہا اور شعر و سخن سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ مشاعروں میں نہایت شان سے غزلیں پڑھتے تھے۔ آخر عمر میں شاعری ترک کر چکے تھے۔ سخن سنجی کے ساتھ سخن فہمی بھی آپ میں تھی، افسوس کہ آپ کا سارا کلام ضایع ہو گیا۔ میں نے ہوش سنبھالا تو ایک چھوٹی سی نامکمل بیاض آپ کے پاس دیکھی جس میں حافظے کی مدد سے کچھ غزلیں آپ نے لکھوائی تھیں۔ اس میں بعض اشعار میرے ہی قلم سے آپ نے لکھوائے تھے۔ یہ بیاض بھی چوری ہو گئی۔ آپ نے ۱۳۴۰ھ (م ۱۹۴۱ء) میں انتقال فرمایا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

بیکسی پر جو غریبوں کی انھیں جلنا تھا — داغ دل شمع مزار شہدا کیوں نہ ہوئے

نہ وہ جلسہ نہ وہ صحبت نہ وہ یاروں کی محفل ہے — مرا عیش گزشتہ آج افسانے میں داخل ہے

وہ جو نامور تھے زمانہ میں کہیں ذکر سن لو فسانے میں — مجھے دیر ہوگی بتانے میں یہی نام ہے کہ نشاں نہیں

(۶) شاہ لال صاحب ۔ سید شاہ نور الرحمٰن عرف شاہ لال نور عظیم آبادی حضرت مبارک عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ کی ولادت ۱۲۸۶ھ میں ہوئی۔ آپ نہایت خوش جمال، خوش اخلاق، اور خوش لباس تھے، مصوری و نقاشی سے خاص ذوق تھا۔ فن قرأت سے بھی واقفیت رکھتے تھے اور قرآن پاک خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ تفنن طبع کے طور پر کبھی کبھی اشعار بھی کہہ لیتے تھے۔ مولانا وحید سے اصلاح لی تھی، آپ نے ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ آپ کی دو رباعیاں مجھے مل سکیں جو حاضر ہیں ؎

اے بندہ نواز بندہ پرور تو ہے — قادر ہے توانا ہے تونگر تو ہے

کرتا نہیں رزق تو خطا پر بھی بند — الطاف میں ماں باپ سے بڑھکر تو ہے

غم جن کا ہمیں کبھی گوارا نہ ہوا — مشکل میں انہی کا کچھ سہارا نہ ہوا

روتا ہے اسی بات کا ہم کو اے نور — ہم سب کے ہوئے کوئی ہمارا نہ ہوا

(۷) کمال عظیم آبادی ۔ خان بہادر سید شاہ محمد کمال کمال عظیم آبادی حضرت مبارک عظیم آبادی کے بڑے صاحبزادے تھے، ۱۲۹۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۲۸ھ میں خان بہادری کے خطاب سے سرفراز ہوئے، آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ تیس ہزار سالانہ آمدنی کی جایداد والد سے ملی تھی، ساری دولت عیش و عشرت کی نذر ہو گئی۔ جوانی میں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے انھیں بیعت حاصل ہوئی تھی۔ مولانا شاہ احمد میاں سے خلافت بھی ملی تھی۔ ابتدائے شباب میں مولانا وحید کے شاگرد ہوئے۔ مولانا کے انتقال کے وقت انکی عمر صرف انیس سال کی تھی۔ آخر عمر میں تمام منہیات سے تائب ہو کر سوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند ہو گئے تھے اور اذکار و اشغال میں مصروف رہتے تھے۔

(۸) احمد حسین احمد عظیم آبادی ۔ یہ بھی مولانا وحید کے شاگردوں میں تھے۔ میں نے انھیں حضرت شاد مرحوم کے ہاں ایک غزل پڑھتے سنا تھا۔ سن رسیدہ آدمی تھے، کلام میں کوئی خاص بات نہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے تھے ویسے یہ بھی تھے۔

ولی کاکوی

"گاہے گاہے باز خواں ——"

خُدا نے دُنیا کو کیوں پیدا کیا

یہ ایک سوال ہے جو ایک ہندو سوسائٹی نے مجھ سے کیا ہے؟

یہ سوال خالص مذہبی ہے۔ یعنی یہ جستجو اسی شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو خدا کے وجود کا قایل ہے اور ایشور کا پایا جانا تسلیم کر چکا ہے، لیکن جو منکر خدا ہے وہ کون اور کس لئے کی گفتگو نہیں کرتا بلکہ اس کی تلاش یہ ہوتی ہے کہ یہ عالم کیونکر ظہور میں آیا اور اس کے اندر انسان کی حیثیت کیا ہے؟

ایک پابند مذہب انسان چونکہ خدا کو بالکل اسی طرح کا صناع و خلاق مانتا ہے جس طرح ایک کمہار یا بڑھئی کو کہ جو برتن اس کے جی میں آیا بنا دیا جس طرح کی چوکی چاہی اس نے طیار کر دی، اس لئے اصولاً اس کے سامنے کیونکر کا سوال نہیں آسکتا، کیونکہ ایک قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہستی کو ہر وقت قدرت و اختیار حاصل ہے کہ جب چاہے بغیر کسی ذریعہ و سبب کے اپنے ارادہ سے ہیزدہ ہزار عالم پیدا کر دے اور جب اس کے جی میں آئے آناً فاناً محو کر دے، لیکن ایک منکر چونکہ دُنیا کی پیدائش کو کسی ہستی کے ارادہ سے متعلق نہیں سمجھتا بلکہ اس کو مخصوص اسباب سے وابستہ جانتا ہے اور تدریجی ارتقا کا قایل ہے اس لئے لامحالہ اُسے غور کرنا چاہئے کہ اُصول آفرینش کیا ہیں اور کن اسباب کے تحت کائنات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

بہر حال اس باب میں ایک مذہبی انسان کا نقطۂ نظر، منکر کے نقطۂ نظر سے بالکل علٰحدہ ہے اور اس لئے اگر مندرجۂ عنوان سوال دونوں کے سامنے پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ دونوں کا جواب ایک دوسرے سے مختلف ہوگا لیکن گفتگو اس میں ہے کہ کیا واقعی دونوں اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہیں، ایک مذہبی شخص جو پیدائش عالم کے لئے کسی علت و سبب کے وجود کو ضروری نہیں سمجھتا وہ نتیجہ و غایت پر غور کرنے کا مستحق کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے یعنی جب اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ خدا قادرِ مطلق ہے اور کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا وہ جو چاہے پیدا کر دے اور جب چاہے فنا کر دے، تو پھر کیوں کا سوال کیسا، یہ "چون و چرا" تو اسباب و علل سے متعلق ہوا کرتی ہے اور جب وہاں سرے سے اسی کا انکار کیا جاتا ہے تو استفسار کیوں؟ البتہ ایک منکر کے متعلق خیال ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پر غور کیا ہوگا لیکن اگر انصاف سے پوچھئے تو کہنا پڑے گا "کیوں" کا جواب نہ خدا کا اقرار کرنے والا دے سکتا ہے نہ انکار کرنے والا، کیونکہ جس طرح مذہب آج تک غایت آفرینش کو نہیں سمجھ سکا، اسی طرح سائنس بھی اس معمہ کو حل نہیں کر سکی یعنی اگر ایک پابند مذہب شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کے پیدا کرنے سے خدا کا کیا مقصود ہے تو بڑے سے بڑا سائنس داں بھی نہیں کہہ سکتا کہ مادہ و قوت کے اس ہیجان کا نتیجہ کیا ہوتا ہے لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ باوجود اس نااہلی کے دونوں اس کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اصرار کرتا ہے کہ وہی حق پر ہے، درآنحالیکہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ادنےٰ دلیل بھی اس دعوے کے لئے موجود نہیں ہے، اہلِ مذاہب میں ایک جماعت تو علماء ظواہر کی ہے جو اپنے آپ کو مخصوص شریعت کا پابند کہتے ہیں اور جو مذاہب کو صرف اُن کتابوں سے سمجھنا چاہتے ہیں جو اُن کے اسلاف لکھ گئے ہیں اور جن کی بنا پر سوسائٹی کا نظام مقرر کیا گیا تھا، دوسری جماعت اہلِ تصوف کی ہے جنھوں نے اپنے مسلک کا نام شریعت نہیں بلکہ طریقت رکھا ہے اور جو تمام مسایل کو روحانیت سے سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں —— مسلمانوں میں اول الذکر جماعت کے پاس اس سوال کا کھُلا ہوا جواب موجود ہے اور اُن کو زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قرآن نے کھُلے ہوئے الفاظ میں اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے کہ —— "ماخلقتُ الانس والجن الا لیعبدون"۔ یعنی ہم نے انسان و جنات کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ

عبادت کریں، اس لئے اگر آج عبادت کی کیفیت و ہیئت متعین ہو جائے تو ایک مسلمان کے پاس اس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں عام طور پر عبادت کا مفہوم نہ صرف اسلام بلکہ تمام دیگر مذاہب میں وہی ہے جسے پوجا یا پرستش سے ظاہر کیا جاتا ہے، لیکن چونکہ دنیا میں کوئی فعل ارادہ و نتیجہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اس لئے ہر شخص کا خواہ وہ کسی مذہب سے متعلق ہو، فطری حق ہے کہ وہ ان دونوں باتوں پر غور کرے یعنی ایک یہ کہ وہ کس ارادہ و نیت سے خدا کی پوجا کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ جو غرض و غایت اس نے سمجھ رکھی ہے وہ عبادت سے کس حد تک پوری ہوتی ہے۔ مذہبی اقوام میں بلا استثناء کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اس ارادہ و نیت سے عبادت نہ کرتی ہو کہ اس سے خدا خوش ہوگا اور وہ ہماری مشکلات کو دور کرے گا۔ پھر اگر واقعی کبھی کسی کے مصائب دور ہو جاتے ہیں تو وہ اس کو اسی عبادت کا نتیجہ خیال کرتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ پر الزام قایم کرتا ہے کہ جو حق عبادت کرنے کا تھا وہ ادا نہ ہوا اور خدا کی خوشنودی حاصل نہ ہو سکی — اس میں کلام نہیں کہ جس حد تک انسان کے جذبات و تاثرات کا تعلق ہے اس خیال سے اس کو کافی تسکین ہو جاتی ہے اور وہ مایوسی کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے لیکن جب جذبات کی دنیا سے علٰحدہ ہو کر سوال صرف علمی تحقیق کا ہوتا ہے یا کسی ایسے شخص کی تسکین کا جو کسی معلول کا وجود بغیر علت کے ماننے کے لئے طیار نہیں تو لامحالہ غور کرنا پڑتا ہے کہ عبادت سے خدا کا خوش ہونا کیا معنی رکھتا ہے اور خدا کی خوشی یا رضامندی کا ہمارے دنیاوی حالات و اسباب سے کیا تعلق ہے — اس سلسلہ میں سب سے پہلے حقیقت خدا کا مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی یہ کہ جب تک ہم کو پہلے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ خدا کیا ہے، اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے اس وقت تک نہ ہم عبادت کی کوئی علمی توجیہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں۔

خدا کے متعلق انسان کا اولین تصور بالکل وہی ہے جو دنیا کے کسی مستبد بادشاہ و حکمران کے متعلق ہو سکتا ہے یعنی خوشامد و تملق سے خوش ہونا ——— تحائف و نذرانہ قبول کر کے نظر التفات صرف کرنا، اور سرتابی و نافرمانی سے غضب آلود ہو کر سزائیں دینا، اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ نفس خدا کی ماہیت و حقیقت پر بعض مذاہب کے خیالات زیادہ بلند و لطیف ہو گئے ہیں، لیکن جس حد تک پرستش کا تعلق ہے، خدا کی ہستی اب بھی وہی خوش یا ناخوش ہو جانے والی بتائی جاتی ہے اور اپنے بندوں کو سزا یا انعام دینے سے بدستور وہی دلچسپی اس کو باقی ہے۔

ایک طرف تو یہ بتایا جاتا ہے کہ خدا زمان و مکان سے علٰحدہ، احساس و تاثر سے بیگانہ اور بے نیاز مطلق ہے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ وہ برہمی و خوشنودی کا محل ہے اور انعام و انتقام کا جذبہ اس کے اندر پایا جاتا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ہی وقت میں خدا کو دو متضاد صفات کے ساتھ متصف کرنا کیونکر ممکن ہے اور اس کی خوشنودی یا برہمی کیا معنی رکھ سکتی ہے جبکہ وہ خود نہ کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے اور نہ اسے پوجا یا پرستش کی ضرورت ہے —— بعض اہل مذہب کہتے ہیں کہ عبادت سے خدا کو خوش کرنے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خود عبادت کرنے والا اس سے فایدہ اٹھائے، یعنی خدا کی پرستش کا مقصود خود اپنی اصلاح ہے بالکل درست۔ لیکن یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ عبادت سے جو اپنی اصلاح وابستہ ہے وہ ہمارے اعمال و افعال سے بھی کوئی تعلق رکھتی ہے یا نہیں یعنی محض ہمارا عبادت کر لینا کافی ہے یا اسی کے ساتھ اپنی زندگی میں بھی تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ محض عبادت خواہ کسی صورت میں ہو بے کار ہے اگر وہ ہمارے اخلاق و اعمال پر اثر انداز نہیں ہوتی اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ عبادت کا مدعا اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنا ہے اور اسی کو خدا کی خوشنودی سے تعبیر کیا گیا تاکہ لوگوں کو اس طرف توجہ ہو اور وہ اسے ترک نہ کر بیٹھیں —— بظاہر یہ بیان بہت قرین عقل و صواب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی گمراہی و شقاوت کا بڑا سبب یہی ہے —— چونکہ اہل مذاہب نے ہمیشہ یہی لوگوں کو سمجھایا کہ خدا کی خوشنودی ہی حاصل کرنا عین مدعا ہے اس لئے یہ بات کبھی ان کے ذہن میں نہ آئی کہ عبادت کا تعلق خود اپنی اصلاح اعمال سے ہے اور اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تغیر نہ پیدا کریں تو عبادت بے کار ہے —— اس کا نتیجہ ایک طرف تو یہ ہوا کہ عبادت نام قرار دیا گیا صرف چند مخصوص حرکات و مراسم کا، اور دوسری طرف لوگوں کے اخلاق پر یہ

خراب اثر پڑا کہ خدا کو عبادت سے خوش رکھنے کے اعتماد پر وہ دنیاوی معاملات میں ہر قسم کی بے عنوانی پر آمادہ ہو گئے اور اخوت و ہمدردی کا جذبہ جو نظام تمدن کی جان ہے ان کے اندر ضعیف ہونے لگا۔

اگر ابتدا ہی سے اس امر پہ زور دیا جاتا کہ خدا تمھاری عبادت سے خوش نہیں ہوتا بلکہ تمھاری اصلاح و ترقی سے خوش ہوتا ہے اور عبادت کا مدعا بھی یہی ہے تو شاید دنیا کی حالت آج دوسری ہوتی ـــــ ہر چند بعض مذاہب نے عبادات کی ماہیت و غایت بیان کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعلان بار بار کیا ہے، لیکن چونکہ عبادت و پرستش میں حیات بعد الموت کی راحت کا خیال بھی شامل کر دیا گیا ہے اس لئے اس دنیاوی زندگی میں اس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہیں ہوا اور عام طور پر لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اصل زندگی تو مرنے کے بعد ہی شروع ہوگی اور چونکہ اس کے متعلق عبادت کے بعد اطمینان ہو ہی گیا ہے اس لئے اس دو روزہ زندگی کی اصلاح میں کیا سر کھپایا جائے ـــ میری رائے میں مذاہب کی سب سے زیادہ خطرناک تعلیم یہی ہے کہ دُنیا فانی ہے، انسان فانی ہے اور بقا اس زندگی کو حاصل ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوگی اور اسی کو سنوارنے کی ضرورت ہے گویا انسانوں کا یہ اجتماع سرائے کے مسافروں کا اجتماع ہے جو صبح یا شام منتشر ہو جانا ہے ـــــــ پھر ظاہر ہے کہ جب تعلیم یہ ہوگی تو باہمدگر کیا ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے اور دنیاوی زندگی کی ترقی و اصلاح کے لئے کون سا جذبہ کام کر سکتا ہے ـــ مسلمانوں میں نماز کا طریق عبادت اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک اجتماعی کیفیت لئے ہوئے ہے، لیکن چونکہ وہاں بھی وہی آخرت و معاد کا خیال ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے اس لئے مسلمان اگر یکجا جمع ہوتے ہیں تو صرف انفرادی طور پر اپنی اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اور اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترقی کا کوئی سوال ان کے سامنے نہیں ہوتا ـــ چنانچہ آپ کسی بڑی سی بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دئے گئے ہیں اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے درد دُکھ کی خبر نہیں ہے ـــ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو اور سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کریں اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش، ضعیفوں اور بیماروں کی نگرانی، مفلسوں اور ناداروں کی امداد، جماعتی تنظیم، اقتصادی مشکلات اور سیاسی مسایل پر گفتگو کر کے لائحۂ عمل بھی طیار کرتے رہیں تو کتنا فایدۂ عظیم مترتب ہو سکتا ہے ـــ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کی مسجدیں ان کے دارالاجتماع تھے، جہاں قوم کے تمام معاملات پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن آج مولوی کہتا ہے کہ مسجد میں بیٹھ کر کوئی بات دنیا کی نہ کرو۔ یعنی صرف اُس دنیا کی بات کرو جس کا علم تمھیں تو نہیں ہے لیکن اس مولوی کو ضرور ہے جو خدا کے "خلوتیانِ راز" میں ہے اور جس کے اختیار میں ہے خواہ تم کو جہنم میں ڈال دے یا فردوس بریں میں بھیجدے ـــــ علماء ظواہر کے مفہوم عبادت نے جو مذموم صورت اختیار کر لی ہے اس کا حال تو آپ کو اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا، اب رہ گئے اہلِ دل جو بجائے شریعت کے طریقت پر کاربند ہیں تو اس میں شک نہیں کہ جس حد تک خدا کے تصور کا تعلق ہے وہ زیادہ کامیاب ثابت ہوئے اور انھوں نے عقیدۂ "ہمہ اوست" سے خدا کی تعبیر بڑی حد تک قابلِ قبول صورت میں پیش کی، لیکن عبادت کے مسئلہ کو وہ بھی نہ حل کر سکے اور چونکہ معاد و آخرت کی زندگی اُن کے یہاں بھی اصل چیز تھی اس لئے باوجود گانے بجانے کا شوق رکھنے کے وہ عبادت کے مسئلہ میں علماء ظواہر کی پابندیوں سے علیحدہ نہ ہو سکے اور شریعت کے مقابلہ میں اُن کی طریقت اپنا کوئی مستقل ادارہ جداگانہ قایم نہ کر سکی ـــ الغرض مسلمانوں کی طرف سے اس سوال کا جواب دینا کہ خدا نے انس و جن کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ اس کی عبادت کریں، عام متبادر معنی کے لحاظ سے انسانی دنیا کے لئے مفید ثابت نہیں ہوا ـــــ دنیا میں ترقی یافتہ مذاہب دو طرح کے ہیں، ایک وہ جنھوں نے صرف عملی زندگی کو سامنے رکھ کر چند اصول سوسائٹی کے مرتب کرنے پر اکتفا کی، ہر چند اول الذکر مذاہب کی تعلیم کا بھی حقیقی مقصود وہی سوسائٹی کی اصلاح تھا لیکن جس طرح براہ راست عملی زندگی کا درس دینے والے مذاہب حیات بعد الموت کے قایل ہو کر مراسم و شعائر میں اُلجھ کر رہ گئے، اسی طرح فلسفہ پیش کرنے والے مذاہب بھی نفسیاتی گتھیوں کے سلجھانے میں محو ہو کر ایسے دور از کار قیاسات میں مبتلا ہو گئے کہ سوسائٹی کا مفاد بالکل نظر انداز ہو گیا

اور ان کی فلسفیانہ عقل آرائیاں مادی حقیقتوں سے فایدہ اُٹھانے کا کوئی لائحہ عمل بنی نوع انسان کے سامنے پیش نہ کرسکیں ـــــ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ مذہب کا تعلق کسی قومی عروج وارتقاء سے نہیں ہے جس کے لئے تیغ و تفنگ کا جارحانہ یا مدافعانہ استعمال ضروری ہو بلکہ صرف فلسفۂ حیات پر غور کرنے اور خاموشی سے رموز زندگی حل کرنے سے ہے، تو بتایئے کہ ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت، نروان، اہمسا اور مکتی نے دنیا کو کیا فایدہ پہونچایا یعنی اگر تلوار ہاتھ میں لے کر دنیاوی جاہ وحشم کو اپنے لئے مخصوص کرلینے سے دنیا کو کیا فایدہ پہونچا تو بودھ کی طرح کاسۂ گدائی لے کر در در کی بھیک مانگنے سے نوع انسانی کو کیا نجات حاصل ہوئی ـــــ اگر کسی قوم نے اسے تلوار سے مجروح کیا تو دوسری نے اُسے اپاہج بنایا، اگر ایک نے نفس پرستی وخودغرضی کو رواج دیا تو دوسری نے اُسے نفس مدعا اور غرض مشترک کو محو کرکے انسانی عزایم کو سرد کردینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھا ـــــ الغرض نوع انسانی کو نہ ان مذاہب سے کوئی فایدہ پہونچا جو یکسر عمل ہونے کے مدعی ہیں اور نہ اُن مذاہب سے جو صرف عقاید پیش کرنا منتہائے نظر سمجھتے ہیں ـــــ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بڑا سبب مسئلہ "روحانیت یا مابعد الطبیعیات" ہے جس نے انسان کی دنیاوی زندگی کو بالکل پس پشت ڈال دیا اور حقیقی زندگی کو اس عالم سے متعلق ہی نہ سمجھا۔ اگر یہاں کی زندگی کو اہمیت دی جاتی تو اس کی اصلاح کی طرف توجہ بھی کی جاتی ـــــ

ـــــ لیکن بلا استثناء تمام مذاہب نے مادی حیات کی تخفیف کی اور اس کو ناقابلِ اعتنا سمجھا اس لئے اصولاً کوئی مذہب دنیاوی لحاظ سے کامیاب نہ ہوا اور انسان کے نفسیاتی میلان نے جو ہنگامہ یہاں برپا کر رکھا ہے اس کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

یہی تلخ تجربہ تھا جس نے دنیا میں مادہ پرست جماعت پیدا کردی اور دُنیا کو دُنیا کے اصول سے سمجھنے اور کاربند ہونے پر مجبور کردیا۔

پھر ہر چند ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مادیئن نے جو کچھ سمجھا وہ بالکل درست ہے یا ان کے مقرر کئے ہوئے اصول دنیا کے امن ونجات کے ضامن ہوسکتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کا مقصود بالکل برمحل ہے اور "قضیہ مین برسرزمین" کے اصول پر کاربند ہوتے ہوئے وہ انسانی دماغ کی بہت سی تشویشوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان کے سامنے نہ ایسے خدا کا سوال ہے جس نے قادرِ مطلق اور "فعال لما یرید" ہونے کی حیثیت سے انسان کو دُنیا میں عضو بیکار بنا رکھا ہے اور نہ وہ اپنا وقت اس مسئلہ پر غور کرنے میں ضایع کرتے ہیں کہ دُنیا کیوں پیدا کی گئی ـــــ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا پیدا ہوچکی ہے اور اس میں ہم کو زندگی بسر کرنا ہے، اس کے بعد کچھ نہیں ہے اس لئے ہم کو ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس سے فایدہ اُٹھانا چاہئے اور ترقی کی جتنی راہیں ہیں ان پر چل کر دُنیا کو اپنے لئے جنت بنالینا چاہئے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مادی تحریک اخلاق کی ضامن نہیں ہے اور اس سے خودغرضی کا جذبہ قوی ہوکر ایک قوم کا دوسری قوم کو ہلاک کرنا مستبعد نہیں، لیکن اگر صرف اس دلیل پر اس تحریک کو رد کردیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مذہب کی حمایت کی جائے جبکہ اس نے بھی یہی کیا اور اس کے ہاتھ بھی ہمیشہ خون سے رنگین نظر آئے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ ایک نے خدا کا نام لے کر تلوار اُٹھائی اور دوسرا خدا کو بدنام نہیں کرتا اور اپنی ہی اغراض کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے ـــــ علاوہ اس کے ایک مسئلہ اور اس جگہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ مادیئن کا مذہب ہنوز ارتقاء کی حالت میں ہے اور بالکل ممکن ہے کہ آیندہ کوئی صورت ایسی پیش آئے کہ انسان خونریزی سے باز رہنے پر مجبور ہوجائے ـــــ یہ حالت موجودہ نظام تمدن نے جو ہمیشہ مادی ترقی پر قایم ہے، وسیع ہوکر ایسی عجیب وغریب صورت اختیار کرلی ہے کہ آہستہ آہستہ تمام قومیں، تمام جماعتیں، بلکہ جملہ افراد ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں، یعنی اغراض کی تکمیل روز بروز باہمی تعاون پر منحصر ہوتی جارہی ہے، پھر کیا یہ امر خلاف عقل ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب باہمی تصادم کی تمام صورتیں مسدود ہوجائیں اور تمام نوعِ انسانی ایک نظام سے وابستہ ہوکر ایک قوم، ایک جماعت، ایک ہیئت اور ایک سوسائٹی میں بدل جائے یہاں تک کہ باہمی جنگ وخونریزی کا امکان باقی نہ رہے ـــــ اس وقت جس چیز نے دُنیا میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے وہ

سرمایہ داری اور اشتراکیت کی جنگ ہے یعنی دُنیا اب اس کو برداشت نہیں کرسکتی کہ انسان انسان میں تفریق صرف اس بنا پر قایم ہو کہ ایک کے پاس دولت کا انبار ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے، دولت انسان ہی کی پیدا کی ہوئی ایک مفروضہ قوت ہے جس سے اسوقت تک کام لیا جاسکتا ہے، جب تک سب یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے رہیں لیکن اگر یہ مساوات مفقود ہوجائے اور دولت انسانیت کو پامال کرنے میں صرف ہونے لگے تو اس کو مٹ جانا چاہئے چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت یوروپ کا ہر ملک اس جذبہ سے متاثر ہو رہا ہے اور تمام وہ حکومتیں جو سرمایہ دارانہ استبداد و استعمار پر قایم تھیں ایک ایک کرکے اشتراکی اصول پر کاربند ہونے کے لئے مجبور ہو رہی ہیں پھر اگر ساری دُنیا میں اشتراکیت پھیل جائے اور دولتمندی و افلاس کا مفہوم ہی بالکل بدل جائے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس وقت بھی ایک انسان دوسرے انسان سے اور ایک جماعت دوسری جماعت سے برسرپیکار ہوگی؟ ہرگز نہیں، کیونکہ سارا اختلاف تو اسی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فلاں سرمایہ دار ہے اور فلاں تہی دست لیکن اگر یہ اختلاف مٹ کر تمام انسان ایک سطح پر آجائیں تو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور اس امن و سکون کو حاصل کرسکتی ہے جسے مذاہب عالم اسوقت تک حاصل نہیں کرسکے۔

اس لئے بہ حالت موجودہ ہمارا یہ سوچنا کہ خدا نے کائنات کو کیوں پیدا کیا، حد درجہ تضیع اوقات ہے، سوچنے کی بات صرف یہ ہے کہ جب ہم اس دُنیا میں آگئے ہیں تو ہم کو زندگی کیونکر بسر کرنا چاہئے اور اپنا وقت کس طرح صرف کرنا چاہئے۔

خُدا کی حقیقت کیا ہے، دنیا سے اس کا کیا تعلق ہے، اس تعلق کی بنا پر ہم کیا کرسکتے ہیں اور کیا نہیں یہ سب ایسے دوراز کار سوالات ہیں کہ نہ اس وقت تک ان کا کوئی شافی جواب دیا جاچکا ہے اور نہ آیندہ ممکن ہے انسان واقعات و حوادث کا بندہ ہے اسباب و علل کی دُنیا میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لئے اُسے انھیں باتوں پر غور کرنا چاہئے جس سے اس کی زندگی متعلق ہے اگر خدا دنیا میں آکر ہمارے کاموں میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتا تو ہم کو کیا حق حاصل ہے کہ اس کے متعلق گفتگو کرکے اپنا وقت ضایع کرتے رہیں اگر اُس نے "کُن" کہکر دفعتہً عالم کو پیدا کردیا تو کیا اور تدریجی ارتقاء کے ساتھ عالم کو سنوارا تو کیا — انسانی درد و دکھ کا علاج ان میں سے کسی اعتقاد سے متعلق نہیں — پھانس اگر چبھی ہے تو اس کی تکلیف اس کے نکالنے ہی سے دور ہوسکتی ہے نہ کہ اس بات پر غور کرنے سے کہ پھانس کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیونکر گوشت کے اندر پہونچ گئی۔

گھر میں جس وقت آگ لگتی ہے تو اس کا سبب دریافت کرنے سے پہلے اس کے بجھانے کی فکر ہوتی ہے۔

اس لئے وہ لوگ جو حقیقی معنی میں نوع انسانی کے خیرخواہ ہیں، ان کو نہ خدا کی حقیقت پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور نہ یہ سوچنے کی کہ اس نے دُنیا کو کیوں پیدا کیا، بلکہ صرف ان تدابیر پر غور کرنے کی تمام کہ انسان باہم مل کر صلح و آشتی کی زندگی کیونکر بسر کرسکتے ہیں۔ مذاہب تو اس تجربہ میں ناکام رہے، اس لئے لامحالہ ہمیں اُن سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا پڑے گی، خواہ وہ اشتراکیت ہو یا کچھ اور — پھر اب دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ زمانہ کا رخ کیا ہے۔ سیلاب کا بہاؤ کس طرف ہے — اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا تو بے شک ہم کو نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ ورنہ خس و خاشاک کی طرح بہہ جانا یقینی ہے اور مذاہب کا تنکا ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

مکتوبات نیاز

(خاص رعایت اخیر اپریل تک)

کی تین جلدیں ہیں اور تیسری جلد میں حضرت نیاز کی تصویر بھی شامل ہے۔ ان تینوں جلدوں کی قیمت مع محصول ۱۳ء۵ہ ہے، لیکن خریدارانِ نگار انھیں مع محصول گیارہ روپیہ میں حاصل کرسکتے ہیں۔

منیجر نگار

عہدِ مُغلیہ میں شاہزادیوں کی تعلیم

(زیب النساء)

عہدِ مغلیہ کی خصوصیات عہد مغلیہ کی جتنی خصوصیات مورخین نے ظاہر کی ہیں، اگر ان سب کو پیشِ نظر رکھ کر، اک اجمالی نتیجہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ بابر سے لیکر جو ہندوستان کے عہدِ مغلیہ کا موسس اولین تھا، بہادر شاہ ظفر کے وقت تک جو اس بزم ملوکانہ کا آخری بدنصیب "تاجدار رہا، کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں حضارت و تمدن اور تہذیب و شایستگی کے کھلے ہوئے آثار نظر نہ آتے ہوں۔

حرم کی پرسکون زندگی سے لیکر، جہاں خلوت کا حصار اک انسانی حقیقت کو زیادہ صحیح روشنی میں پیش کرتا ہے، دربار کے ہنگامہ تک، جہاں شخصی حکومت کو اظہار کبر و نخوت کے بہترین مواقع حاصل ہوتے ہیں، کوئی مغل فرمانروا ایسا نہیں گزرا جس نے جادۂ اعتدال سے انحراف کیا ہو یا عوایدِ تہذیب کا سررشتہ ہاتھ سے دیدیا ہو۔

ایک حکومت کے صحت و سقم معلوم کرنے کا بہترین معیار، اس کا نظام تعلیم ہے اور غالباً یہ خصوصیت صرف تیموریہ خاندان ہی کے افراد کو حاصل ہے کہ اُن میں سے کوئی فرد ایسا نہیں گزرا جو اس سے غافل ہو گیا ہو اور جس نے علوم و فنون کو عام کر دینے میں پوری کاوش سے کام نہ لیا ہو۔

تعلیم نسواں عہدِ حاضر میں جبکہ تمام علوم و فنون عروج کے بلند ترین نقطہ تک پہونچ گئے ہیں، یہ حقیقت عام طور سے تسلیم کرلی گئی ہے کہ ایک ملک و قوم کی تہذیب اور شایستگی کی قوی ترین دلیل یہ ہے کہ اس کی عورتیں مہذب و تعلیم یافتہ ہوں اور جب ہم اس معیار کو پیشِ نظر رکھ کر، عہدِ مغلیہ پر تنقید کرتے ہیں تو ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ زمانۂ حکومت ہند کا بہترین زمانہ تھا اور اگر ہم تاریخ ہندوستان میں کسی عہد کو "عہدِ زریں" کہہ سکتے ہیں تو وہ مغلوں ہی کا دورِ حکومت تھا۔

یوں تو عہدِ مغلیہ سے قبل بھی مسلمان فرمانروایانِ ہند اس طرف سے غافل نہ تھے اور خواتین کی تعلیم کے لئے اُس وقت بھی خاص انتظام کیا جاتا تھا، لیکن عہدِ مغلیہ میں اس کی اہمیت زیادہ بڑھ گئی اور شاہزادیوں کی تعلیم کا اہتمام وسیع پیمانہ پر کیا گیا۔

بابر کی عمر جس اضطرار و اضطراب میں بسر ہوئی، وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن باایںہمہ اس کا علمی ذوق کبھی اس سے جدا نہیں ہوا اور اسی کا اثر تھا کہ اس کی بیٹی گلبدن بیگم، باوجود بے سروسامانی کے تعلیم سے محروم نہیں رہی اور آج بھی وہ اپنی تصنیف ہمایوں نامہ کے ذریعہ سے روشناس عالم ہے۔ ہرچند تاریخ اس باب میں ساکت ہے کہ گلبدن بیگم کی تعلیم کن اصول پر ہوئی، لیکن اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اس نے جو لائبریری اپنے لئے فراہم کی تھی وہ اس وقت کی بہترین لائبریری سمجھی جاتی تھی۔

علاوہ گلبدن بیگم کے ہمایوں کی بھانجی سلیمہ سلطانہ بھی اپنے عہد کی نہایت قابل خاتون تھی اور ہیئت و ریاضی کی بڑی ماہر۔ ادبی قابلیت اور پاکیزگی ذوق کے ثبوت میں اس کا یہ شعر لکھ دینا کافی ہے:۔

کاکلت را من زمستی رشتۂ جاں گفتہ ام
مست بودم، زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

یہی وہ سلیمہ سلطانہ ہے، جو بعد کو اکبر سے منسوب ہوئی۔ یہ ذکر ہے عہدِ بابر کا جب مغلوں کی حکومت نہایت محدود تھی اور کوئی معقول انتظام لڑکوں کی تعلیم کا بھی نہ تھا، چہ جائیکہ لڑکیاں، ورنہ عہدِ اکبری میں تو تعلیم خواتین کے لئے باضابطہ مدرسہ قایم ہو گیا تھا جس کے

آثار فتحپور سیکری میں اب بھی موجود ہیں اور متعدد خواتین ایسی نکلیں جن کی قابلیت صفحات تاریخ پر منقوش ہے۔

نورجہاں بیگم، جہاں آرا، ممتاز محل، روشن آرا، حمیدہ بانو، رضیۃ النساء، حمیدہ خاتون، موتی بیگم، اشرف النساء وغیرہ وہ ہستیاں تھیں جن پر عورت کی دنیا ناز کرسکتی ہے اور جن کی علم پروری کا یہ عالم تھا کہ باوجود برہمی و بیزاری کے وہ کمال کی داد دینے سے احتراز نہ کرتی تھیں۔ جہاں آرا بیگم (زیب النساء کی پھوپھی) کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دفعہ باغ میں سیر کی غرض سے گئی اور پردہ کرا دیا گیا، لیکن صیدی طہرانی باغ کے کسی حجرہ میں چھپ گیا اور سواری کا تماشہ دیکھنے لگا۔ جب جہاں آرا بیگم، چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے اس طرف سے گزری تو صیدی نے بیتاب ہوکر یہ مطلع پڑھا:۔

برقع بہ رُخ افگندہ بَرَد ناز بہ باغش
تا نکہتِ گل بیخت آید بہ دماغش

بیگم نے حکم دیا کہ اس شخص کو سامنے لایا جائے، جب صیدی سامنے آیا تو بیگم نے کئی بار اس شعر کو سُنا اور حکم دیا کہ اسے شہر سے باہر نکالدیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ ذوقِ ادب کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی اور پانچ ہزار روپیہ بھی بطور انعام اس کو دئے گئے، انھیں میں سے ایک زیب النساء بیگم بھی تھی۔

افسوس ہے کہ اس محترم خاتون کے حالات بہت کم ملتے ہیں اور مفصل واقعات زندگی کہیں درج نہیں ہیں، تاہم جو کچھ معلوم ہے وہ بھی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ وہ غیر معمولی دل و دماغ کی عورت تھی اور فضل و کمال اور فراست و ذہانت کے لحاظ سے، وہ حقیقی معنی میں اورنگ زیب کی بیٹی تھی۔

اورنگ زیب کی شادی

شاہجہاں کی حکومت شباب پر تھی یعنی آل مغلیہ کے اس لطیف الطبع فرمانروا کی حکومت کا دسواں سال تھا کہ اسے اورنگ زیب کے عقد کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ دربار مغلیہ بہترین علماء و فضلاء کا مرکز رہا کرتا تھا اور منتخب ترین صاحبان سیف و قلم وہاں جمع رہتے تھے اس لئے شاہزادگانِ مغلیہ کا رشتۂ ازدواج انہی امراء کے خاندانوں میں کیا جاتا تھا اور اسی کی پیروی شاہجہاں نے بھی کی۔

بدیع الزماں صفوی جس نے عہدِ جہانگیری میں اپنی ممتاز خدمات کی وجہ سے شاہ نواز خاں کا لقب حاصل کیا تھا، دربار شاہجہانی سے وابستہ تھا اور اس کی بیٹی دل رس بانو بیگم اپنے حسن صورت و سیرت کے لحاظ سے مشہور تھی۔ چنانچہ شاہجہاں نے اورنگ زیب کی رفیق بننے کے لئے اس سے بہتر کسی کو نہ پایا اور ۱۰۴۲ھ میں چار لاکھ مہر پر رشتۂ مواصلت قایم کردیا گیا۔ طالب کلیم کا مادۂ تاریخ "دو گوہر بہ یک عقد دوراں کشیدہ" اسی واقعہ کی یادگار ہے۔

زیب النساء کی ولادت اور اس کا عہدِ طفلی

اورنگ زیب، دکن کا گورنر ہونے کی وجہ سے دولت آباد میں مقیم تھا کہ شادی کے دوسرے سال ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں زیب النساء پیدا ہوئی۔ چونکہ اورنگ زیب کی پہلی اولاد تھی اس لئے اظہار مسرت میں دکن کے اس اولوالعزم گورنر نے نہایت فیاضی اور سیر چشمی سے کام لیا۔

جب زیب النساء کی عمر چار سال سے متجاوز ہوگئی تو اورنگ زیب کو اس کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا اور جستجو کی گئی کہ امرائے دربار میں سے کس امیر کے گھر کی عورتیں اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دے سکتی ہیں، آخرکار عنایت اللہ خاں فیضاپوری کی ماں حافظہ مریم (جسے حافظہ صرف اس لئے کہتے تھے کہ وہ حافظۂ قرآن بھی تھی) ابتدائی تعلیم کے لئے منتخب ہوئی۔ حافظہ مریم نہایت قابل خاتون تھی اور مذہبی معلومات کے لحاظ سے ایک جید عالم کا درجہ رکھتی تھی۔ حافظہ مریم نے سب سے پہلے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا اور چند سال میں اُسے بھی اپنی طرح حافظ بنا دیا۔ اورنگ زیب کو اس قدر مسرت ہوئی کہ اس نے علماء عصر کو دعوت دی اور دربار عام منعقد کرکے حافظہ مریم کو تیس ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔

تعلیم کلام مجید حفظ کرنے کے بعد ملا جیون جو اورنگ زیب کے بھی اُستاد رہ چکے تھے، عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے مامور ہوئے۔ زیب النساء چونکہ حد درجہ ذہین واقع ہوئی تھی اس لئے اس نے بہت جلد تمام علوم متداولہ حاصل کر لئے۔ افسوس ہے کہ تاریخ کی کتابیں اس باب میں ساکت ہیں اور زیب النساء کے عہد تعلیم و تربیت کے جزئیات سے کسی مورخ نے بحث نہیں کی، ورنہ یقیناً بہت دلچسپ موضوع سخن ہوتا۔ تاہم اس امر پر تمام مورخین متفق ہیں کہ اس کی تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی اور نحو و صرف، فقہ و حدیث میں مہارت تامہ رکھتی تھی۔ وہ بے انتہا خوشخط بھی تھی اور نسخ، نستعلیق اور شکست خط اس قدر پاکیزہ ہوتا تھا کہ اسے بہترین نقاشی کے حدود میں جگہ دی جا سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ شعر و ادب کا ایسا صحیح ذوق اس کے اندر پایا جاتا تھا کہ جب ۲۱ سال کی عمر میں وہ تحصیل علوم سے فارغ ہوئی تو اس کا دربار علماء و فضلاء، شعراء، ادباء کا مرکز ہو گیا اور اس کی علم پروری، نکتہ شناسی، صحت فکر، اصابت رائے، پاکیزگیِ ذوق اور لطافت طبع تمام مجالس کا ایک مستقل موضوع گفتگو ہو کر رہ گئی۔

شعراء اور اہلِ کمال کی قدردانی چونکہ اورنگ زیب کو شعراء کی طرف زیادہ میلان نہ تھا اور وہ شعر کی اہمیت کو صرف بقدر ضرورت تسلیم کرتا تھا، اس لئے وہ قدر شناسی شعر کے لحاظ سے کسی خاص امتیاز کا مالک نہیں تھا۔ لیکن چونکہ قدرت کو عہد مغلیہ کی اس روایت دیرینہ کو بدستور قایم رکھنا منظور تھا، اس لئے اُس نے زیب النساء کو پیدا کر دیا جس نے اپنے باپ کی اس کمی کو بوجہ احسن پورا کیا اور اُس وقت کے تمام شعراء دربار زیب النساء کے وظیفہ خوار ہو گئے۔

اورنگ زیب کی بیٹی کا صرف ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہونا فطرت کی ایسی ستم ظریفی ہے کہ اُس کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے لیکن چونکہ یہ ذوق اس کا فطری ذوق تھا اس لئے اورنگ زیب بھی اسے باز نہ رکھ سکا اور مجبوراً ملا سعید اشرف کو جو اس عہد کا نہایت مشہور شاعر تھا مامور کیا کہ وہ شہزادی کی نظم و نثر کو بہ نظر اصلاح دیکھا کرے۔

زیب النساء کو نظم کا اس قدر شغف تھا کہ اس کے گرد و پیش ہر وقت یہی ذکر رہتا تھا اور اس کی کنیزیں تک اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تذکرۂ ماہ درخشاں میں اس کی ایک کنیز امانی دہلوی کا یہ شعر نقل کیا ہے:-

آنقدر روزِ ازل تیرہ نصیبم کردند
تیرگی می طلبد شامِ غریباں از من،

علم نوازی اور عام اخلاق ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ شعراء کی ایک جماعت اس کی وظیفہ خوار تھی لیکن وہ صرف شاعری میں اپنا وقت ضایع نہ کرتی تھی، بلکہ اپنی نگرانی میں وہ اہلِ کمال سے مختلف فنون کی کتابیں بھی مرتب کراتی تھی۔ چنانچہ اس غرض کے لئے بہت سے علماء اور خوشنویس بھی اس کے وظیفہ خوار تھے۔ زیب النساء نے تصنیف و تالیف کی غرض سے ایک کتب خانہ بھی قایم کیا تھا، جس کے متعلق مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے کہ اس عہد میں کوئی کتب خانہ اس درجہ مکمل و مرتب نہ تھا، اسی کتب خانہ کے متعلق اس نے اکاڈیمی قایم کی تھی، جہاں علمائے عصر تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ افسوس ہے کہ ان تمام کتابوں کی فہرست جو اس دارالعلوم میں تصنیف کی گئیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ صرف امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ جسے ملا صفی آردبیلی نے کیا تھا اور جو زیب التفاسیر کے نام سے مشہور ہے زیب النساء کی یادگار باقی رہ گیا ہے۔

خود زیب النساء نے جو تصانیف کیں اُن کا بھی علم کسی کو نہیں۔ تذکرۂ مشاہیر نسواں میں مونس الارواح کو اور تذکرۃ النقراب میں زیب الانشات کو اس سے منسوب کیا ہے۔ اول الذکر تصنیف تصوف میں تھی اور دوسری اس کے رقعات و خطوط کا مجموعہ تھا۔

زیب النساء اپنی فطرت کے لحاظ سے حد درجہ نفیس الطبع، متحمل مزاج، رقیق القلب اور متصوفانہ رنگ کی خاتون تھی۔ وہ اہلِ کمال کی قدر کرنے میں بسا اوقات حد سے گزر جاتی تھی، ایک بار ملا سعید اشرف کو زیب النساء نے ایک کنیز مرحمت کی، لیکن وہ کنیز ملا صاحب کے مذاق کے موافق نہ تھی، اس لئے انھوں نے اس کو ایک طویل قصیدۂ ہجو کے ساتھ واپس کیا۔ اس قصیدہ کے بعض اشعار نہایت غیر مہذب اور

نامناسب تھے، لیکن زیب النساء نے کچھ نہیں کہا اور خاموش ہوگئی۔

اسی طرح نعمت خان عالی نے جو اس عہد کا نہایت مشہور شاعر تھا ایک مرتبہ کوئی مرصع کلغی فروخت کے لئے پیش کی اور جب عرصہ تک کوئی جواب نہ ملا تو یہ رباعی لکھ کر بھجوادی۔

اے بندگیت سعادتِ اخترِ من — درخدمتِ توعیاں شدہ جوہرِ من
گرچیغہ خریدنی است پس کو زرِ من — درنیست خریدنی بزن بر سرِ من

زیب النسا نے پانچہزار روپئے بھجوادئے اور کلغی بھی واپس کردی۔

زیب النساء ہرچند درویشانہ مذاق رکھتی تھی تاہم وہ حد درجہ نفیس المزاج تھی، چنانچہ کشمیر میں جو اس کی جاگیر میں تھا نہایت عمدہ باغ نصب کرایا اور اس میں نفیس عمارتیں طیار کرائیں۔ اس نے ایک بڑا خیمہ ابرک کا بھی طیار کرایا تھا جو بالکل شیشہ کا معلوم ہوتا تھا۔ نعمت خان عالی کی مثنوی اس خیمہ کی تعریف میں مشہور ہے۔

زیب النسا کو اپنے بھائیوں سے بہت محبت تھی، یہاں تک کہ جب ۱۱۰۵ھ میں اعظم شاہ مرض استسقا میں مبتلا ہوا اور زیب النساء اس کی تیمارداری بنی تو جب تک وہ بیمار رہا سوائے اس پرہیزی غذا کے جو محمد اعظم کھاتا تھا اس نے بھی اور کچھ نہ کھایا۔ دوسرے بھائی اکبر شاہ کی محبت میں تو وہ قید ہی ہوگئی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

الغرض زیب النساء کی یہی وہ صفات تھیں جنھوں نے اس کو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا اور جن کی وجہ سے اورنگ زیب بھی اسکی بے حد عزت کرتا تھا۔

جب کبھی زیب النساء باہر سفر سے آتی تو اورنگ زیب شاہزادوں کو اس کے استقبال کے لئے بھیجتا۔ جب تک عالمگیر نے فتح دکن کی طرف توجہ نہیں کی، زیب النساء ہمیشہ سفر حضر میں اس کے ساتھ رہی اور وہ ہمیشہ اس کے مشوروں سے فایدہ اُٹھاتا رہا۔

زیب النساء کی شاعری

زیب النسا کو شاعری کا جس قدر صحیح ذوق حاصل تھا، اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ اپنے کلام کا ایک دفتر چھوڑ جاتی، لیکن افسوس ہے تذکرہ نویسوں کو اس کا کلام بہت کم دستیاب ہوا۔

چونکہ مخفی متعدد خواتین اور بعض مردوں کا بھی تخلص[1] تھا، اس لئے تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ موجودہ دیوان مخفی جو عام طور سے پایا جاتا ہے واقعی زیب النسا کا تھا۔ بعض صاحبانِ تذکرہ نے صرف یہ دو شعر اس کے نقل کئے ہیں:-

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد — کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بہ فرقے جا گرفت — غنچۂ باغِ دل ما زیبِ دستارے نشد

لیکن تذکرۂ شمع انجمن، تذکرۃ الخواتین اور تذکرہ مشاہیر نسواں میں اور اشعار بھی اس کے درج کئے ہیں، جن کا انتخاب ہم یہاں پیش کرتے ہیں:-

خیز کرشمہ ریز کن نرگسِ نیم مست را — از تہِ جام جرعہ دہ ساقیِ مے پرست را
بہر شہادتِ جہاں یک نگہ از تو بس بود — گرم غضب چہ میکنی غمزۂ تیز دست را
قطع جفا نمی کند دلبرِ شوخ و مست ما — ترک وفا نمی دہد ایں دلِ خود پرست ما

---

[1] سلیمہ بیگم، امام قلی خاں حاکم فارس کا ایک مصاحب، حضرت جامی کے استاد، زیب النساء کا ایک خادم اور آخر عہد میں سلطان جہاں بیگم اور میرزا قادر بخش شہزادۂ دہلی کا بھی یہی تخلص تھا۔ سلطان جہاں کا ایک شعر اس وقت یاد آگیا:-

"خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی — کہ اس ظالم پر جی کو بھاتا بہت ہے"

باز امشب نالۂ زارم پریشاں می رود — سیل اشکم دست در آغوشِ طوفاں می رود
تو و بوستانِ حسن کہ نسیم زر نیابد — من و نالہ ہائے زاری کہ بلب گزر نیابد
پروانہ نیستم کہ بیکدم عدم شوم، — شمعم کہ جانگدازم و دودے نیاورم
نہال سرکش و گل بے وفا و نالہ دورنگ — دریں چمن بہ چہ امید آشیاں بندم
اے صبا خاک رہش آرد بہ اندازِ بہ چشم — کہ بلاہا ہمہ زیں رخنہ بروں می آید
آں شوخ چیر بند سوارِ سمند شد — یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد
از ما مپوش چہرہ کہ ما بے ادب نہ ایم — کوتہ تراست از مژۂ مانگاہِ ما،
نورم، نارم، حدیقہ ام، گلزارم — دیرم، صنم، برہمنم زنارم،
نے نے غلطم دریں میاں ہیچ نیم — بوئے گلم و طبیعت بیمارم،
بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا — بت پرستی کے کند در برہمن بیند مرا
در سخن پنہاں شدم مانند بو در برگِ گل — ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا
از تاب و تبم مہر سمارا کہ خبر کرد، — وز گریۂ من ابر و ہوا را کہ خبر کرد
بیروں ہمہ سرسبز درونش ہمہ پرخوں — از حالتِ من برگ حنا را کہ خبر کرد

شادی سے احتراز

مغلوں میں عام دستور تھا کہ وہ لڑکیوں کی شادیاں پختہ عمر میں کیا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ زیب النساء کے عقد کا خیال اس وقت آیا جب وہ سن وقوف کو پہونچ چکی تھی، پھر چونکہ اس عرصہ میں ایک خاص قسم کا صوفیانہ اور درویشانہ مذاق اس کے دل میں پیدا ہوگیا تھا، اس لئے اس نے شادی سے انکار کردیا اور ساری عمر حالت دوشیزگی میں بسر کردی۔

زیب النساء اور عاقل خاں

اُردو کی معمولی اور سوقیانہ لٹریچر میں عام طور سے مشہور ہے کہ زیب النسا کو عاقل خاں سے محبت تھی اور خفیہ طور سے باہم ملا کرتے تھے۔

تاریخی اصول سے جب اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو اس کی حقیقت ایک لغو افسانہ سے زیادہ نہیں ٹھہرتی اور سخت افسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے کیوں ایسی عصمت کوش اور عفت مآب خاتون کی روح کو اس اتہام سے اذیت پہونچائی۔

عہدِ عالمگیر اور اس کی ایک صدی بعد تک کی کسی تاریخ میں نہیں پایا جاتا کہ زیب النساء کو عاقل خاں یا کسی اور سے محبت تھی یہاں یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ دربار عالمگیر کے مورخین کیونکر اس راز کو ظاہر کرسکتے تھے، لیکن تماشا تو یہ ہے کہ اس واقعہ کا اُن مورخین نے بھی کہیں ذکر نہیں کیا جو دربار سے غیر متعلق ہوکر مخفی طور پر اپنی تاریخیں مرتب کررہے تھے۔ اس کا ذکر نہ خافی خاں نے کیا ہے جس نے اپنی تاریخ کو عالمگیر کے ایک ربع صدی بعد مرتب کیا اور نہ مآثر الامرا میں اس کا بیان ہے جو اس کے بعد کا تذکرہ ہے علاوہ انکے بھیم سین اور ایشور داس ہندو مورخین بھی اس باب میں ساکت ہیں، حالانکہ ان کی تاریخ بہت بعد کو منصۂ شہود پر آئی۔

برنیر اور منوچی نے بھی، جنھوں نے صرف اپنے ہی ملک کے لئے واقعات سیاحت قلمبند کئے تھے اور جنھیں مغل دربار کا کوئی خوف نہ تھا، اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، درانحالیکہ انھوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمام وہ باتیں درج کردی ہیں جن سے مغل دربار کی توہین ہوسکتی تھی۔ اگر زیب النسا کے عشق و محبت کا افسانہ صحیح ہوتا تو کیا وہ اسے نظر انداز کرجاتے اور کیا اس سے بہتر موقع طعن و تشنیع کا انہیں کوئی مل سکتا تھا۔ خافی خاں جو تمام روایات کو بلا نقد و تحقیق درج کرنے میں بے انتہا دلیر واقع ہوا تھا اور جس نے نورجہاں اور جہانگیر کے معاملۂ محبت پر سخت نکتہ چینی کی ہے وہ بھی زیب النسا کے حالات میں کہیں اس کی محبت کا ذکر نہیں کرتا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانہ اٹھارویں صدی کی اختراع ہے اور سب سے پہلے جس نے یہ غیر معصوم لٹریچر پیش کیا وہ منشی احمد الدین لاہوری ہیں جنھوں نے محمد الدین خلیق کی حیات زیب النساء کو پیش نظر رکھ کر درمکتوم کے نام سے ایک کتاب اس محترم خاتون کے حالات میں مرتب کی۔ اس کے بعد مسز ولیٹ بروک نے دیوان زیب النساء کے دیباچہ میں اسی کتاب سے مدد لیکر انگریزی میں بھی اس کذب کو منتقل کر دیا یہانتک کہ اب عام طور سے ہر شخص زیب النساء کو اسی روشنی میں دیکھنے لگا۔

مسز ولیٹ بروک لکھتی ہیں :- "۱۶۶۲ء کی ابتدا میں جب اورنگ زیب بیمار ہوا اور اطبائے دربار نے تبدیل آب وہوا کا مشورہ دیا تو وہ تمام خواتین حرم کے ساتھ لاہور چلا گیا۔ اس وقت عاقل خاں جو اورنگ زیب کے وزیر کا بیٹا تھا، لاہور کا گورنر تھا۔ چونکہ یہ خود بھی اچھا شاعر تھا، اس لئے زیب النساء کے کلام کو سن سن کر غائبانہ عاشق ہوگیا تھا اور اس کو دیکھنے کے لئے از بس بیتاب تھا، چنانچہ اس نے قصر شاہی کے چاروں طرف حفاظت و نگرانی کے بہانہ سے طواف کرنا شروع کیا کہ شاید اسی طرح کوئی جھلک نظر آجائے۔ ایک صبح جبکہ وہ دیوار کے نیچے کھڑا تھا، زیب النساء گلنار لباس میں بام خانہ پر جلوہ افروز ہوئی۔ عاقل خاں نے اس کو دیکھتے ہی فوراً یہ مصرعہ پڑھا " سرخ پوشے بہ لبِ بام نظر می آید " زیب النساء نے جواب میں دوسرا مصرعہ پڑھا "نہ بزور و نہ بزاری نہ بہ زر می آید"۔ چونکہ زیب النساء کو لاہور بہت پسند آیا تھا اس لئے اس نے وہیں ایک باغ کی طرح ڈال دی اور نہایت شوق سے اس کی تعمیر و انتظام میں دلچسپی لینے لگی۔ ایک دن عاقل خاں کو معلوم ہوا کہ زیب النساء باغ میں موجود ہے اور سنگ مرمر کی جو عمارت وہاں طیار ہو رہی تھی اسے دیکھ رہی ہے۔ عاقل خاں بھی ایک معمار کے لباس میں وہاں پہونچ گیا اور باہم تبادلۂ اشعار ہوا۔ اس کے بعد یہ دونوں ملتے رہے اور اورنگ زیب کو بھی اس کا حال معلوم ہوا جو اس وقت دہلی میں تھا چنانچہ یہ فوراً لاہور گیا اور زیب النساء کی شادی کر دینی چاہی۔ زیب النساء نے کہا کہ مجھے انتخاب کا اختیار دیا جائے اور جب تصاویر پیش ہوئیں تو اس نے عاقل خاں کو پسند کیا، اورنگ زیب نے عاقل خاں کو طلب کیا لیکن اس کے رقیب نے اسے دھوکا دیکر یہ یقین دلایا کہ اورنگ زیب تمھیں ہلاک کرنے کے لئے طلب کرتا ہے عاقل خاں یہ سن کر ڈر گیا اور تعمیل حکم سے انکار کرتے ہوئے ملازمت سے بھی مستعفی ہوگیا۔ اس کے بعد جب زیب النساء دہلی گئی تو عاقل خاں بھی وہاں پہونچا۔ ایک دن جبکہ یہ دونوں شاہی باغ میں موجود تھے، اورنگ زیب پہونچ گیا اور مجبوراً عاقل خاں کو دیگ میں چھپ جانا پڑا جو وہیں رکھا ہوا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ اس میں پانی گرم کرنے کو رکھا ہے اورنگ زیب نے حکم دیا کہ اس کے نیچے آگ روشن کی جائے، چنانچہ عاقل خاں اسی کے اندر جل کر مر گیا اور زیب النساء قلعۂ سلیم گڑھ میں قید کر دی گئی"۔

یہ ہیں وہ واقعات جو زیب النساء سے منسوب کئے جاتے ہیں اور جو تاریخ کے صحیح معیار پر بالکل لغو اور نادرست ثابت ہوتے ہیں۔ مورخانہ تنقید کا اقتضا ہے کہ سب سے پہلے عاقل خاں کی ہستی پر غور کیا جائے۔

عاقل خاں کا اصلی نام میر عسکری تھا جو ایران کا رہنے والا خوانی الاصل تھا (وزیر کا بیٹا ہونا ثابت نہیں ہے) عہد شاہجہاں میں جب اورنگ زیب کو دکن کا گورنر تھا، تو عاقل خاں اُس کا جلودار (Equerry) تھا، عاقل خاں نہ صرف اپنے عہد کا اچھا شاعر تھا بلکہ درویشانہ ذوق بھی رکھتا تھا، چنانچہ اس نے اپنا تخلص رازی صرف اسی لئے پسند کیا تھا کہ وہ شاہ برہان الدین رازالٰہی کا مرید تھا جب اورنگ زیب حصول سلطنت کے لئے دکن سے دہلی کی طرف روانہ ہوا، تو اس نے خواتین کو قلعۂ دولت آباد میں چھوڑ دیا (یہ واقعہ ۱۶۵۸ء کا ہے) ۶ فروری سے شہر کی گورنری اور اگست ۱۶۵۸ء سے ۱۶۵۹ء کی آخر تک قلعہ کی حفاظت اس کے سپرد رہی۔ جب ۸ فروری ۱۶۶۰ء کو وہ دہلی آیا تو دوآبہ کا فوجدار بنا دیا گیا، نومبر میں بیمار ہوجانے کی وجہ سے، اس نے ملازمت سے دست کشی اختیار کی اور سات سو پچاس روپیہ ماہوار پنشن حاصل کر کے لاہور میں اقامت اختیار کر لی۔

جب نومبر ۱۶۶۳ء میں اورنگ زیب، کشمیر سے واپس ہوا اور مع اپنی خواتین کے لاہور میں مقیم ہوا تو عاقل خاں حاضر ہوا اور اورنگ زیب نے اُسے داروغہ غسل خانہ کر دیا، جو نہایت اعتماد و اعتبار کا عہدہ تھا (یہ واقعہ ۲ نومبر کا ہے) اس کے بعد بھی عاقل خاں پر

عنا[illegible] میں وہ داروغہ ڈاک چوکی (پوسٹ ماسٹر جنرل) بنا دیا گیا، لیکن اپریل ۱۶۶۹ء میں اس نے استعفا دیدیا۔ [illegible] سات سال تک وہ حالتِ گمنامی میں رہا اور تاریخ میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ پھر ۱۶۷۶ء میں ایک ہزار روپیہ ماہوار اس کی پنشن مقرر کی گئی اور ۱۶۸۰ء میں وہ دہلی کا صوبہ دار بنا دیا گیا اور آخر وقت تک (یعنی ۱۶۹۶ء تک) اسی عہدہ پر ممتاز رہا۔

ان تمام واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ عاقل خاں اپنی فطری موت سے مرا، اور دیگ کے اندر جل کر مرجانا بالکل خلاف حقیقت ہے اب دیکھنا چاہئے کہ زیب النساء سے محبت کرنے کے مواقع کب اور کیونکر عاقل خاں کو حاصل ہو سکتے تھے؟

سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ خواتین کی حفاظت و نگرانی کے لئے کبھی کوئی نوجوان آدمی مقرر نہیں ہو سکتا تھا اور اس لئے اس وقت بھی، جب اورنگ زیب دولت آباد سے روانہ ہوا، عاقل خاں سنِ وقوف کو پہونچ گیا ہوگا۔ عاقل خاں کے واقعاتِ حیات استقصاء کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اُسے زیب النساء کا قرب حاصل ہوا بھی ہوگا، تو سب سے پہلے دولت آباد میں (۱۶۵۸ء) اس کے بعد ایک ہفتہ کے لئے لاہور میں (۱۶۶۳ء اور پھر ۱۶۸۰ء سے ۱۶۹۶ء تک) جب وہ دہلی میں مستقل طور سے صوبہ داری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ پھر چونکہ دولت آباد کے قیام میں افسانۂ محبت کا شروع نہ ہونا سب کو تسلیم ہے اور ۱۶۶۳ء میں صرف ایک ہفتہ کی قلیل فرصت معاملہ کو اس حد تک پہونچا دینے کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی، اس لئے ظاہر ہے کہ عاقل خاں کو دہلی ہی کے قیام میں اس کا موقع ملا ہوگا، پھر اگر تمام واقعات تاریخی کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ عاقل خاں دوران قیام دہلی میں جب کہ اس کی عمر پچاس سے متجاوز ہو چکی تھی، کیونکر اس درجہ پر جوش محبت کرنے پر مجبور ہو سکتا تھا کہ دیگ کے اندر جل کر مرجائے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سات سال تک عاقل خاں کا معتوب رہنا، صرف اسی وجہ سے تھا اور اس کے ثبوت میں شہزادۂ اکبر کی وہ تحریر پیش کرتے ہیں جس میں اُس نے اپنی بہن زیب النساء بیگم کو لکھا تھا کہ "چونکہ بادشاہ نے حکم دیدیا ہے کہ کوئی تحریر جسپر عاقل خاں کی مُہر ہو اندر نہ جانے پائے، اس لئے میں اب زیادہ احتیاط سے کام لوں گا۔" لیکن یہ بالکل غلط استدلال ہے، کیونکہ اول تو اس عتاب کے بعد اُس کا پھر دربار عالمگیر میں بار پانا اور معزز خدمات پر مامور ہونا، اس بات کا ثبوت ہے کہ عتاب کی وجہ (اگر کوئی تھا) اور کچھ تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ اورنگ زیب کبھی اس کو دہلی میں رہنے کا موقع نہ دیتا جہاں وہ بآسانی زیب النساء سے مل سکتا تھا۔ یہ تو محض استدلال قیاسی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس عاقل خاں کا ذکر اکبر شاہ کی اس تحریر میں ہے وہ دوسرا شخص تھا، جسے ملا محمد عاقل کہا کرتے تھے۔ چونکہ ملا محمد عاقل اپنے عہد کا بڑا مشہور فقیہ تھا اور مسایل فقہیہ کے متعلق زیب النساء کو اس سے خط و کتابت کرنے کی اجازت تھی، اس لئے اس کی تحریریں قلعہ کے اندر بغیر احتساب کے جا سکتی تھیں اور شاہزادۂ اکبر اسی ذریعہ سے اپنی تحریریں زیب النساء کے پاس بھیجا کرتا تھا، لیکن جب اورنگ زیب کو معلوم ہوا کہ ملا محمد عاقل بھی شاہزادۂ اکبر کا طرفدار ہے تو اُس نے اس کے خطوط کو بھی اندر جانے سے روک دیا جس کا ذکر شاہزادۂ اکبر نے اپنی اس تحریر میں کیا ہے۔ اگر یہاں بجائے ملا محمد عاقل کے عاقل خاں مراد ہوتا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایک باغی کے طرفدار کو وہ چند دن بعد ہی دہلی کا صوبہ دار بنا دیتا۔

اورنگ زیب نے زیب النساء کو ۱۶۸۱ء میں صرف اسی لئے قید کر دیا تھا کہ وہ اپنے حقیقی بھائی شاہزادۂ اکبر سے (جس نے عالمگیر کے خلاف راجپوتانہ میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا) خط و کتابت رکھتی تھی۔ جب یہ بغاوت فرو ہوئی اور اجمیر کے قریب ۱۶۸۱ء میں زیب النساء اور شاہزادۂ اکبر کے خطوط پکڑے گئے، تو اورنگ زیب نے اپنی بیٹی کی پنشن (چار لاکھ) ضبط کر لی اور قلعۂ سلیم گڑھ میں مقید کر دیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب اس کی عمر ۴۳ سال کی تھی اور عاقل خاں پچاس سال سے متجاوز ہو چکا تھا۔ یہ ہیں اصل واقعات جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عاقل خاں اور زیب النساء کا واقعۂ عشق و محبت کس قدر لغو و باطل ہے۔

زیب النساء اور سیواجی

بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جب ۱۶۶۶ء میں بمقام آگرہ سیواجی، اورنگ زیب کے سامنے پیش کیا گیا تو زیب النساء نے اُسے جھروکہ سے دیکھا اور فوراً عاشق ہو گئی۔ نصف صدی سے زاید زمانہ ہوا، جب ایک

بنگالی مصنف نے اس کو ناول کی صورت میں تحریر کرکے یہ بھی بتایا ہے کہ کیونکر ان دونوں نے باہم الگوٹھیاں کیں اور منشی احمدالدین لاہوری سے دوسرے سے جدا ہوئے۔ لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ اس قدر عجیب وغریب کذب ہے کہ اس کی تردید کا خیال بھی دل میں مرتسم نہیں ہوتا۔

فارسی تاریخوں میں تو خیر کہیں اس کا ذکر ہی نہیں ہے، لیکن خود مرہٹی تاریخوں اور سیواجی کے حالات میں بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ کونسی عقل سلیم ہے جو اس بات کا یقین کرلے گی کہ ایک مغل خاتون جو اپنے ذوق شعری کے لحاظ سے حد درجہ لطیف ونازک جذبات کی مالک تھی، سیواجی سے محبت کرنے لگے گی۔

زیب النساء کا مقید ہونا یہ ہم ابھی بیان کرچکے ہیں کہ شاہزادہ محمد اکبر سے خط وکتابت جاری رکھنے کی خطا میں اورنگ زیب نے زیب النساء کو قلعۂ سلیم گڑھ میں مقید کردیا تھا، لیکن اس کے بعد مورخین کا اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ وہ اسی حالت میں مرگئی، بعض کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے چند دن بعد اُسے آزاد کردیا تھا۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حمیدہ بانو کے انتقال پر رسم تعزیت ادا کرنے کے لئے اورنگ زیب نے زیب النسا کو ہی مامور کیا تھا اور شاہزادۂ کام بخش کی شادی بھی زیب النساء کے ہی محل سے ہوئی، چنانچہ یہ باتیں واقعۂ قید کے بعد کی ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی زیب النساء کا قصور معاف ہوچکا تھا اور وہ قید سے آزاد کردی گئی تھی۔

وفات اورنگ زیب کی حکومت کا اڑتالیسواں سال تھا کہ زیب النسا نے دہلی میں انتقال کیا اس کے مدفن کے متعلق مورخین کو اختلاف تھا بعض کہتے تھے کہ کشمیر یا لاہور میں مدفون ہے، سرسید احمد خاں کی رائے تھی کہ وہ دہلی کی زینت المساجد میں مصروف خواب ہے۔ لیکن مولوی محمد حسین آزاد نے خود اس کی قبر کو دیکھا تھا۔ ان کا بیان ہے کہ وہ دہلی میں (کابلی دروازہ کے باہر) مدفون ہوئی اور بعد کو اُدھر ریل نکل جانے کی وجہ سے مقبرہ کے آثار مٹ گئے۔ اس کی قبر کے کتابہ پر واد خلی خبتی کندہ تھا، جس میں ایک عدد کی زیادتی سے تاریخ وفات نکلتی ہے اس کے قبر کی لوح اب تک سکندرہ (آگرہ) میں محفوظ ہے۔

تصانیف نیاز فتحپوری

من ویزداں کامل — ۱۲ر — مذہبی استفسارات وجوابات — ۸ر — جمالستان — ۸ر — نگارستان — ۲ر — شہوانیات — ۲ر

مکتوبات نیاز تین حصے — ۱۲ر — انتقادیات — ۲ر — حسن کی عیاریاں — ۲ر — مالہ وماعلیہ — ۲ر — شہاب کی سرگزشت — ۲ر

فلاسفۂ قدیم — ۱ر — مقالات نیاز — ۱ر — فراست الید — ۱ر — مذہب — ۱ر — نقاب اُٹھ جانے کے بعد — ۸ر

جذبات بھاشا — ۱۲ر — شاعر کا انجام — ۱۲ر — میزان — ۵ر

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں اخیر اپریل ۵۴ء تک

نیجر نگار لکھنؤ

ہَوا کے کرشمے

وہ نظر نہ آنے والی، ہلکی، خنک ہَوا جسے دُنیائے شاعری میں نسیم وصبا کہتے ہیں، جس کی وساطت سے سارے جہان کے عشاق اپنا پیام، محبوب و سرزمین محبوب تک پہونچایا کرتے ہیں اور جو کسی کے بالوں میں جنبش اور لباس میں ایک حسین بے ترتیبی پیدا کرکے خدا جانے کس قدر سرمایۂ شعر پیدا کر جاتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ جب وہ برہم ہو جاتی ہے، جب وہ ذرا خشونت سے کام لیتی ہے، تو منظر حسن وعشق کو کس صورت میں تبدیل کر دیتی ہے اور عالم میں کتنا ہنگامہ پیدا ہو جاتا ہے؟

مناظر فطرت کی داستان کا وہ حصہ، جس کا تعلق خود قوائے فطرت کے کارناموں سے ہے، غالباً کائنات کا دلکش ترین افسانہ ہے اور اگر کوئی شخص غور و تامل سے کام لے، تو وہ بہت کچھ اسباب لطف و مسرت اُس کے مطالعہ سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ بڑے بڑے دریا یہ عظیم الشان پہاڑ، یہ وسیع صحرا، یہ طویل و عریض آبادیاں، یہ موجیں مارنے والے مہیب سمندر، جو رات دن ہماری توجہ اپنی طرف جلب کرتے رہتے ہیں، یقیناً قدرت کی بہترین نشانیاں ہیں، لیکن کیا ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ہم ہَوا کے وجود کو فراموش کر سکتے ہیں جو اگر ذرا برہمی کے ساتھ چند ماہ تک ایک ہی سمت میں اپنی رفتار کو قایم رکھے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں، دریا خشک ہو جائیں، صحرا دریا بن جائے اور دُنیا کی تمام غیر متمدن آبادیاں صفحۂ ہستی سے اس طرح معدوم ہو جائیں گویا وہ کبھی عالم وجود ہی میں نہ آئی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہوا ایک خادم کی حیثیت سے ہماری بہترین معاون ہے وہ ہمارے لئے چکیاں چلاتی ہے، غلہ پیستی ہے، پانی فراہم کرتی ہے، متمدن ممالک میں ڈاک پہونچاتی ہے، مکان صاف کرتی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ہماری ہستی کو قایم رکھتی ہے، لیکن جب وہ ایک خادم کی حیثیت چھوڑ کر ہماری مخدوم بن جاتی ہے اپنا اقتدار ہم پر ثابت کرنا چاہتی ہے، تو اس سے زیادہ ہولناک، اس سے زیادہ مہیب اور اس سے زیادہ تباہ کن چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ اگر ہوا میں تیزی نہ ہو تو اس میں گردش پیدا نہیں ہو سکتی اور کوئی سانس لینے والا جاندار روئے زمین پر زندہ نہیں رہ سکتا لیکن باوجود اس علم کے ہمیں اس امر پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کو روکنے کی تدابیر اختیار کریں اور اس کو زیادہ بے تکلف نہ ہونے دیں، ورنہ ظاہر ہے کہ مکانوں کی دیواریں بالکل بیکار چیز ہیں اور صرف ستونوں پر ایک چھت قایم کرکے نہ ہم حرارت و بارش سے بچ سکتے ہیں نہ سرد ممالک میں ایک بار مکان کی ہوا کو گرم کر لینا مہینوں تک ہمیں ٹھنڈ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

پھر انسان کی کمزوری کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ باوجود تمام احتیاط و تدابیر کے بھی مخلوقات خدا وندی میں سے ایک معمولی چیز، ہَوا کا بھی حریف نہیں بن سکتا، دیوار چین، انسان کی ایک خونخوار ترین قوم کے لئے تو یقیناً حجاب ہو سکی، لیکن وہ ہوا کا مقابلہ نہ کر سکی جو اُسے ایک ریگ کے طویل تودہ میں تبدیل کرتی جاتی ہے۔

چونکہ ہمیں ہَوا دکھائی نہیں دیتی اور صرف اس کے نتائج نظر آتی ہیں اس لئے اُسے زیادہ اہم نہیں سمجھتے، حالانکہ اس نے حقیقتاً دُنیا کی صورت بدل دی ہے اور ایشیا و افریقہ کے بڑے بڑے شہروں کو صفحۂ زمین سے حرف غلط کی طرح محو کر چکی ہے۔ گوبی کا وہ صحرائے عظیم جو اس وقت دس لاکھ مربع میل زمین کو گھیرے ہوئے ہے، کسی وقت آباد تھا، انسانی تہذیب و شایستگی کی علامات سے معمور تھا اس میں دریا بہتے تھے، جھیلیں موجیں مارتی تھیں، تجارت جاری تھی، قافلے گزرتے تھے، معابد آباد تھے، دولت بکھری ہوئی تھی، سرسبز فلک محل قایم تھے، لیکن آج وہ صرف ایک گرم ریگستان ہے اور ہوا نے اس کے دریا کو خشک، اس کی جھیلوں کو عمیق گڈھوں میں تبدیل

کرکے، اس کی آبادی کو بالکل معدوم کرکے ایک بے آب وگیاہ خوفناک ریگزار بنا دیا ہے، نہ وہاں اب کاروان گزرتے نظر آتے ہیں، نہ معابد ہیں نہ آبادیاں، نہ کوئی متنفس نظر آتا ہے، نہ کوئی اور اثر حیات۔

اگر وسط ایشیا کی اس قدیم تہذیب کو پامال کرنے کے لئے، تمام انسانی خونخواریاں اور بے رحمیاں صرف کردی جاتیں اور مہلک ترین آلات آتش بار استعمال کئے جاتے تو بھی یہ نتیجہ نہ پیدا ہوتا جو ہوا نے کر دکھایا۔

یہ درست ہے کہ سمندروں کے تلاطم، دریاؤں کے سیلاب، وحشی اقوام کے حملوں نے بعض قطعات زمین کو تباہ کردیا ہے، لیکن ہوا نے تو ملک کے ملک غارت کردئے ہیں اور اگر علمائے جغرافیہ وطبقات الارض کی تحقیق پر اعتماد کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ براعظم ایشیا کو ایک دن اسی طرح بالکل معدوم ہو جانا ہے، جس کی زمین نہایت سرعت کے ساتھ خشک ہوتی جارہی ہے اور ہوا کی ان تباہ کاریوں کے لئے وسیع جولانگاہ پیدا کر رہی ہے۔

گزشتہ دو ہزار سال کے اندر مغلستان زیر زمین دفن ہو چکا ہے، ایران ریگستان میں تبدیل ہوتا جاتا ہے پھر ظاہر ہے کہ جب زمین میں کافی نم باقی نہ رہے گا، جو نباتات، درخت، گھاس اور جنگلوں کے قیام کے لئے ضروری ہے تو یہ سارا حصہ زمین ریگستان بن جائے گا، اور ایک دن ایشیا کا تمام شمالی حصہ اسی طرح محو ہو جائے گا، جس طرح مغلستان کی قدیم تہذیب۔

اب شمالی افریقہ کو دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا اسباب تھے، جن کی بنا پر ایک مخصوص قطعۂ زمین ایسا خشک ریگستان بن گیا اور اس کے چاروں طرف ہنوز آبادی ورونق موجود ہے۔ نہر سویز کے بقا کا مسئلہ صرف ہوا کی وجہ سے معرض خطر میں ہے کیونکہ ہوا کثرت سے ریگ اس میں ڈالتی رہتی ہے اور اگر ہر سال کثیر صرف کے ساتھ صفائی نہ ہوتی رہے تو وہ دو سال کے اندر پھر سطح زمین کے برابر ہو جائے کم وبیش یہی کرشمے ہوا کے جنوبی افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی پائے جاتے ہیں۔

الغرض ہوا کی قوت عجیب وغریب صورتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عالم میں کیا نہیں کر سکتی۔ اگر وہ ایک طرف دریاؤں اور نہروں کو خشک کرکے سطح زمین کے برابر کرتی رہتی ہے تو دوسری طرف چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرکے اڑا دیتی ہے اور بڑی بڑی بلندیوں کو جھیلوں میں تبدیل کر دیتی ہے، خدا جانے کتنے کوہستانی مقامات ہموار ہو کر زمین بن گئے اور کتنی زمینیں بلند ہو کر ریگ کا پہاڑ ہو گئیں، اسی کے ساتھ یہ کیسا عجیب وغریب تماشا ہے کہ وہی ہوا جو ایک جگہ بربادیاں پھیلاتی ہے، دوسری جگہ اسی بربادی کو آبادی کا سبب بنا دیتی ہے۔ اگر خاک کے باریک ذرے بلند ہو کر ہزاروں میل کا سفر اختیار کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ جہاں پہونچتے ہیں، اس جگہ کو زرخیز بنا دیتے ہیں، چنانچہ وادیٔ نیل کا تمول انھیں ذروں سے قایم ہے جو خدا جانے کہاں کہاں سے اڑ کر یہاں جمع ہو گئے ہیں۔

ہوا جس طرح خشکی میں اپنی قوت کی نمایش کرتی ہے، اسی طرح وہ پانی کے ساتھ بھی جنگ کرتی ہے اور آخرکار وہ کامیاب ثابت ہوتی ہے، دریاؤں کو اُن کے مجرا سے ہٹا دینا، اُن کے رفتار کی سمت بدل دینا اور بڑے بڑے قطعاتِ بحر کو خشک کرکے زمین کے برابر کر دینا اس کا معمولی کرشمہ ہے، گزشتہ تین صدی کے اندر سب سے زیادہ نمایاں مثال اس نوع کی فرانس میں پائی جاتی ہے جہاں ہوا نے دریائے اڈور کا رُخ متعدد بار ادھر سے اُدھر کر دیا ہے اور ساحل گیسکن کے سمندر کو ایک سو میل کے رقبہ تک بالکل خاک وریگ سے پاٹ دیا۔

ہوا زمین کی خاک کو جس قدر طویل سفر کراتی ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں جب جزیرۂ کراکٹو کا کوہ آتش فشاں مشتعل ہوا تو ہوا اُس کی راکھ کو سارے کرۂ ارض کے گرد لئے پھری اور یہ سفر صرف اُس نے پندرہ دن کے اندر طے کر لیا، اس راکھ کے بعض اجزاء ایسے بھی تھے، جنھیں مسلسل تین بار ہوا نے زمین کے گرد پھرایا اور بعض کو برابر تین سال تک گردش میں رکھا، الغرض دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا، جہاں اس خاک کے ذرات نہ پہونچے ہوں۔

ہوا کی تباہ کاریاں اس قدر کثیر اور عام ہیں کہ اگر اُن کا استقصا کیا جائے تو اس عنصر کی نہایت ڈراونی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے جس وقت اڈی اسٹون کا سب سے پہلا مینار روشنی کا بنایا گیا تو چار سال تک وہ نہایت محفوظ حالت میں رہا، لیکن ایک رات جو ہوا برہم ہوئی تو اُس کو اُٹھا کر ایک سمندر میں پھینک دیا اور چٹانوں سے ٹکرا کے چور چور کر دیا، پھر اُس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہزاروں مکانوں کو مسمار کر کے خدا جانے کتنے آدمیوں اور جانوروں کو تباہ کر دیا اور لندن کے ہزاروں دد و کش زمین کے برابر ہو گئے دریائے ٹیمس کو ۲۰ فٹ بلند کر کے ایک ہزار کشتیاں اس نے غرق کر دیں۔

۱۸۹۰ء میں جب سمندر کے اندر ہوا کا طوفان آیا تو بڑے بڑے جہازوں کا سطح آب پر یہ عالم تھا جیسے لڑکوں نے کاغذ کی کشتیاں بنا کر چھوڑ دی ہوں، صرف ایک جہاز سلامت رہا اور وہ بھی اس طرح کہ دس ہزار گھوڑوں کی طاقت صرف کرنے کے بعد بھی وہ ہوا کے مقابلہ میں ایک انچ آگے نہ بڑھ سکا اور کامل ۴۸ گھنٹے تک اپنی جگہ پر ہچکولے کھاتا رہا۔

اسی طرح ۱۹۳۱ء میں ویسٹ انڈیز میں طوفان آیا اور چند گھنٹوں کے اندر ڈیڑھ ہزار آدمیوں کو فنا کر گیا۔ اس طوفان نے ۲۵ ہزار میل کا سفر کیا اور جہاں کہیں پہونچ گیا اک عام تباہی پھیلا دی، درخت اُکھڑ گئے، مکان گر گئے، بڑی بڑی توپیں گاڑیوں سے سڑک کر زمین پر آرہیں، سمندر میں طغیانی پیدا ہو گئی۔ جہازوں کے لنگر قایم نہ ہو سکے اور کھیتیاں تباہ و برباد ہو گئیں۔

چند سال ہوئے کنٹکی میں ہوا کا طوفان آیا اور میلوں تک جنگلوں کو اس طرح صاف کر دیا جیسے یہاں سے کوئی لشکر گزر گیا ہو سینکڑوں مکان گر گئے اور ہوا کی سمت کوئی درخت، کوئی مکان، کوئی ستون تار کا قایم نہ رہ سکا۔

آئرلینڈ اور امریکہ میں جب طوفان آتا ہے تو ریل پٹڑی سے اُتر جاتی ہے، ساحل کلیر پر تو ہوا کی سختی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ریل کی ریل پٹڑی سے اُڑ کر دور گر جاتی ہے، چنانچہ اس نواح کی ریلوں میں ایک آلۂ طوفان پیما لگا رہتا ہے اور اسی کے ساتھ ایک برقی گھنٹی ہوتی ہے جب ہوا کی رفتار ۶۵ میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے تو یہ گھنٹی بجنے لگتی ہے اور ٹرین کو خارجی وزن سے ہلکا بنا دیا جاتا ہے اور جس وقت یہ رفتار ۸۵ میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے تو ریلوں کی آمد و رفت بند کر دی جاتی ہے۔

ہوا اس تباہکاری کے ساتھ کبھی کبھی خوش طبعی سے بھی کام لیتی ہے اوہیو کے ایک قصبہ میں ہوا نے ایک لڑکے کو مکان کی کھڑکی سے اُٹھا کر باہر پھینک دیا اور سو گز تک بلند لے گئی، وہاں پہونچکر لڑکے نے دیکھا کہ اس کا مکان تک غائب ہو چکا ہے اور زمین سے اندازاً ساٹھ گز اوپر معلق ہے۔ اس مکان کے بعض تختوں کو ہوا سات آٹھ میل تک لے گئی اور وہاں زمین میں اس طرح نصب کر دیا جیسے کسی نے نہایت اہتمام سے یہاں گاڑ دیا ہو۔ ایک اور موقع پر ہوا نے کسی کے ڈسک کو جس میں تین قفل لگے ہوئے تھے توڑ کر اس کی چیزوں کو منتشر کر دیا اور ایک کھڑکی کو ۲۰ میل تک اُڑا کر لے گئی۔

بظاہر ہوا کا میلوں تک چیزوں کو اُڑا کر لے جانا مستبعد معلوم ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب وہ جنبش میں آجاتی ہے تو پھر بہت دیر بعد حالتِ سکون میں آتی ہے۔ جب ریل اپنی پوری رفتار سے سفر کرتی ہے تو نہایت آہستہ تدریجی انحطاط کے ساتھ وہ ٹھہرتی ہے، پھر ظاہر ہے کہ ہوا جو اتنی عظیم الشان چیز ہے جب حرکت میں آجائے گی تو اس کے ٹھہرنے کے لئے کتنا وقت درکار ہوگا، ایک پروفیسر نے اندازہ کیا ہے کہ اگر تمام کرۂ ہوا بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت میں آجائے تو کم از کم ۴۳ ہزار سال اس امر کے لئے درکار ہوں گے کہ اس کی رفتار بیس میل سے گھٹ کر دس میل فی گھنٹہ تک پہونچ جائے۔

اب اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہوا ہمارے لئے مفید کس قدر ہے اور دُنیا کی رونق میں اس نے کتنا حصہ لیا ہے۔ اگر ہوا کا وجود نہ ہوتا تو نہ کولمبس، امریکہ دریافت کر سکتا اور نہ ڈریک کرۂ ارض کے گرد گھوم سکتا، نہ کوک آسٹریلیا کی مہم سر کر سکتا اور نہ قدیم انسان اپنے قدیم وطن کو چھوڑ کر دنیا میں منتشر ہو سکتا۔ ہوا تھی جس نے بادبانی جہازوں کو تمام اطراف عالم میں لے جا کر انسان کو روئے ارض پر پھیلایا اور تہذیب و تمدن کی بنیاد قایم کی۔ دخانی جہاز تو اس وقت کی اختراع ہے، لیکن اس سے قبل تجارت، صنعت و حرفت، دولت اور سب

وہ کچھ جو تمدن کے وسیع بین الاقوامی تعلقات سے وابستہ ہے، بادبانی جہازوں ہی کے ذریعہ سے قایم تھا اور ہوا کی جنبش ہی پر اس کا وجود منحصر تھا۔

ہوا کی دوسری عظیم برکت بارش ہے، حرارتِ آفتاب سے پانی کے اجزا دھوئیں کی صورت میں بلند ہوتے ہیں اور اوپر پہونچ کر بادل بنجاتے ہیں، اس کے بعد فطرت ہوا کو طلب کرتی ہے اور ان بادلوں کو ادھر اُدھر لے جانے کی خدمت اس کے سپرد کردیتی ہے، اگر ہوا نہ ہو تو بادل جم کر ایک جگہ رہ جائیں اور ساری کھیتیاں خشک ہوجائیں۔ چنانچہ ہمارا تجربہ ہے کہ جس سال ہوا نہیں چلتی اکثر مقامات میں قحط ہوجاتا ہے اور ہزاروں مخلوق مرجاتی ہے۔

علاوہ اس کے موسموں کا تغیر و تبدل، زمین کی اصلاح، لوگوں کے مزاج کا اعتدال بہت کچھ ہوا پر منحصر ہے، مثلاً جزیرۂ انگلستان اگر جنوب و مغرب کی ہوا سے محروم ہوجائے تو وہاں کے لوگ سردی کی وجہ سے برف کی طرح جم کر رہ جائیں یا اگر حبش وغیرہ میں شمالی ہوا کا گزر نہ ہو تو حرارت آفتاب کی وجہ سے وہ جل کر خاک ہوجائیں۔ نباتاتی دُنیا میں بھی اس کے کارنامے عجیب و غریب ہیں، تم نے دیکھا ہوگا کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں لاکھوں قسم کے پھول اور درخت نظر آتے ہیں۔ یہ سب ہوا کی وجہ سے ہیں کیونکہ یہی مختلف مقامات کے بیج اِدھر سے اُدھر منتقل کرتی ہے اور بہت سے خشک مقامات کو شاداب بنا دیتی ہے۔

الغرض ہوا، فطرت کی قوت کا عجیب و غریب مظہر ہے اور اس کی داستان نہایت پر لطف۔ اگر ایک طرف وہ لوگوں کو کبھی کبھی تکلیفیں پہونچاتی ہے تو دوسری طرف اس سے ہماری راحت و آسایش کے اسباب بھی متعلق ہیں اور اگر کسی وقت برہم ہوکر تباہیاں پھیلاتی ہے، تو اس سے زیادہ وہ حُسن و حیات کے ذرایع بھی دنیا میں منتشر کرتی رہتی ہے، جس سے تمام کائنات مستفید ہوتی ہے۔

شعراءِ فارس کے لطایف

ایک ایرانی قبیلہ "کبود جامہ" کے سردار نصرالدین سے سلطان تکش برہم ہوگیا اور ایک فوجی افسر کو مامور کیا کہ نصرالدین کا سر کاٹ کر لے آئے۔ جب یہ افسر، نصرالدین کے پاس پہونچا تو اس نے نہایت الحاح و زاری سے افسر کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ اسے ابھی قتل نہ کرے اور سلطان کے دربار تک پہونچادے۔ جب افسر اسے زندہ و سلامت لے گیا تو سلطان تکش، بہت برہم ہوا اور وہ کوئی سخت حکم اس کے خلاف دینے ہی والا تھا کہ نصرالدین نے اسی وقت یہ دو شعر بادشاہ کو سنائے:۔

من خاکِ تو در چشمِ خرد می آرم — عذرت نہ یکے، نہ دہ، کہ صد می آرم
سرخواستہ ای، بدستِ کس نتواں داد — من آیم و بر گردنِ خود می آرم

سلطان کا غصہ فرو ہوگیا اور اس کی جاں بخشی کردی۔

شیخ الاسلام تبریز نے ایک بار ملا محمد عصار (شاعر) کو ایک پرانا لباس انعام دیا۔ مذہبی علماء کی طرف سے جب کوئی عطیہ کسی کو دیا جاتا تھا تو اس کو بڑی عزت سے قبول کیا جاتا تھا، لیکن عصار نے اس عطیہ کی رسید میں یہ اشعار لکھ کر بھیجدیئے:۔

جامۂ بخشید شیخ اسلامِ اعظم بندہ را — دہ مبارک جامۂ سالِ فراواں یافتہ
رشتہ، حوا از برائے آدمش در بر دو حال — مریمش در کارگہ از بہرِ عیسیٰ یافتہ
دامنِ از منسوجِ پشمِ ناقۂ پیغمبرش، — فاطمہ گشتہ رفوگر ہر کجا افگافتہ
من چہ دارم کز پوشم جامۂ را کاندراں — آفتابِ طلعتِ چندیں پیمبر تافتہ

دعوتِ نقد و نظر

اکتوبر ۵۳ء کے نگار میں عہدِ حاضر کے ایک مشہور غزل گو کے چند اشعار پیش کر کے اہلِ نقد کو ان پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی، چنانچہ نومبر اور دسمبر ۵۳ء کے نگار میں بعض حضرات کی رائیں اس سلسلہ میں شایع ہو چکی ہیں۔

باقی رائیں اب شایع کی جا رہی ہیں اور ان سب کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میری طرح دوسروں نے بھی ان اشعار کو نقایص سے خالی نہیں پایا

قبل اس کے کہ آپ اس اشاعت میں ان آرا کا مطالعہ کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار پھر ان اشعار کو نقل کر دیا جائے، تاکہ قارئین نگار کو اکتوبر ۵۳ء کا نگار دیکھنے کی ضرورت نہ ہو:۔

۱۔ کچھ داغِ دل سے تھی مجھے امید عشق میں، سو رفتہ رفتہ وہ بھی چراغِ سحر ہوا

۲۔ اِدھر جوشِ مستی، اُدھر چشمِ شوق مصیبت میں بندِ نقاب آگیا،

۳۔ پردہ رکھنا تھا جو منظور تو عاشق کے لئے دامنِ یار کو لازم تھا، گریباں ہونا،

۴۔ حُسن کے افسانۂ غم، باغ میں کھلا گئے پھول شاق گزرا مجھے بلبل کا غزل خواں ہونا

۵۔ چاہئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر ایک ہلال سا

۶۔ نگہِ شوق نے سب کھول دئے بندِ نقاب سہل سمجھے تھے وہ پابندِ حیا ہو جانا

۷۔ ہر وقت اک خمار تھا، ہر دم سرور تھا بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

۸۔ جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا اُس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

۹۔ دل نہ تھا، جان نہ تھی، سوز نہ تھا، ساز نہ تھا میں ہی میں تھا، مرے ہمراہ، کوئی راز نہ تھا

۱۰۔ بہت روکا تمھارے وعدۂ دیدار نے ورنہ وہاں ہوتی نہ میری بیخودی بھی، میں جہاں ہوتا

۱۱۔ خلوت میں غمِ فرقت، اس طرح بیاں ہوتا وہ میری زباں بنتے، میں ان کی زباں ہوتا

۱۲۔ تھی سیر اگر میں بھی ساتھ اُن کے وہاں ہوتا آنسو بھی رواں ہوتے، دریا بھی رواں ہوتا

۱۳۔ جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے خبر نہیں، کہ گریباں بھی تار تار ہوا،

۱۴۔ زخم کو مرہمِ دل، درد کو درماں سمجھا چارہ گر، خوب علاجِ غمِ پنہاں سمجھا

۱۵۔ عشق کا راز، وہی سوختہ ساماں سمجھا جس نے دامن کبھی جانا، نہ گریباں سمجھا

۱۶۔ تھا کھیل سا پہلے عشق، لیکن جو کھلیں آنکھیں ڈوبا ہوا رگ رگ میں، وہ تیرِ نظر دیکھا

۱۷۔ اُس چشمِ غزالیں کو مے خانۂ دل بایا، اُس روئے نگاریں کو، فردوسِ نظر دیکھا

۱۸۔ اے نگاہِ یاس! یہ کیا رنگِ محفل ہو گیا میں نے جس دل کی طرف دیکھا، مرا دل ہو گیا

۱۹۔ جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا — رازِ مے خانے سے باہر نہ ہو مے خانے کا
۲۰۔ کھلے گا چارہ گر پر رازِ غم، کیا درد کے ہوتے — کہ آتا ہے اسے خود نبض کی رفتار ہو جانا
۲۱۔ جس پر برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار — ہر ذرہ آفتاب ہے اُس کے مزار کا
۲۲۔ اللہ اللہ، یہ کمالِ جذبۂ پنہانِ عشق — جو گرا آنکھوں سے آنسو حُسن کا دریا ہوا
۲۳۔ بڑھتے بڑھتے آفتابِ روزِ محشر بن گیا — دل کی خاکستر میں اک شعلہ تھا جو بھڑکا ہوا
۲۴۔ رگ رگ میں دل تھا، دل میں نہاں سوز و ساز تھا — وہ دن بھی کیا تھے، جب میں سراپا گداز تھا
۲۵۔ اللہ رے، مجبوریِ آدابِ محبت — گلشن میں رہے، اور گلستاں نہیں دیکھا
۲۶۔ شریک نالہ میرا بھی جو اندازِ فغاں ہوتا — چمن میں ہر لبِ خاموش، بلبل کی زباں ہوتا

سید اختر علی تلہری

موجودہ زمانہ میں شعر و سخن کے فنی پہلوؤں کی طرف مختلف وجوہ سے بہت کم توجہ کی جا رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاصے پڑھے لکھے لوگ الفاظ و تراکیب و محاورات و مفاہیم کی صحت کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ جو لفظ جہاں چاہا استعمال کر دیا۔ اُلٹی سیدھی جو ترکیب ذہن میں آئی لکھ دی۔ اسی لئے اخبارات و رسایل میں جو منظومات شایع ہوتے ہیں اُن میں فنی اغلاط کی افراط ہوتی ہے۔ اُستادی و شاگردی کا سلسلہ بھی پُرانی بات ہو گئی ہے اس وجہ سے فنی غلطی اور بھی بڑھ گئی ہے ــــ لایق مدیر نگار نے فنی اغلاط پر احتساب کا جو سلسلہ "مالہ و ماعلیہ" کے عنوان سے قایم کیا تھا اُسے میں نے ہمیشہ پسندیدگی دیکھا کیونکہ اس طرح نئے ادیبوں اور شاعروں کو بہت سے فنی نکتے بغیر کسی زحمت کے معلوم ہو جاتے تھے، اکتوبر ۵۳ء کے نگار میں دعوتِ نقد و نظر کے عنوان سے ایک مشہور شاعر کے چند اشعار حضرت نیاز نے جو پیش کئے ہیں اُس کا خیر مقدم فنی خلوص کے تحت ضروری ہے۔

سطورِ ذیل میں اپنی بساطِ فہم کے مطابق اُن پر مختصر طریقہ سے اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے۔ اس سے میرا مقصد شاعر کی تنقیص قطعاً نہیں ہے بلکہ فنی تنقید کے اہم مطالبہ پر صدائے لبیک بلند کرتا ہے۔

(۱) کچھ داغ دل سے تھی مجھے امید عشق میں الخ

اس شعر کا مفہوم غزل کے عام لہجہ کے خلاف ہے، عشق کا بخشا ہوا دل کا داغ محبت کی یادگار ہوتا ہے اس لئے اُس کا رفتہ رفتہ مٹ جانا عشق کی شان کے خلاف ہے۔ "چراغِ سحر" سے اُس کی زوال آمادگی ہی کی طرف اشارہ ہے ــــ اس کے علاوہ کسی دوسرے مفہوم کی اس شعر کے الفاظ میں گنجایش نہیں ہے[1]

(۲) اِدھر جوشِ مستی اُدھر چشمِ شوق الخ

مصیبت میں آجانا محاورہ ہے یا نہیں اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے شعر کا مفہوم رکیک و سخیف و مبتذل ہے۔ "جوشِ مستی" کے استعمال نے اسے مکمل طور پر بازاری بنا دیا۔ لفظ "مستی" کو اگر سابقہ سے کسی اور لفظ کی طرف مضاف کیا جائے تو اس کے استعمال کے لیے وجہ جواز نکل سکتی ہے ورنہ یوں تو اس کا استعمال ممنوع ہے[2]۔

---

[1] ایک اور نقص بیان اس شعر میں یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ میں "رفتہ رفتہ" کے ساتھ "چراغِ سحر ہوا" کہنا غلط طریقِ اظہار ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "داغِ دل" بھی رفتہ رفتہ مٹ گیا یا مٹنے کے قریب ہے اور لفظ "ہوا" "رفتہ رفتہ" کے ساتھ یہ معنی پیدا نہیں کرتا۔ نیاز

[2] "بندِ نقاب" کی مصیبت کا سبب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف عاشق کا جوشِ مستی۔ معشوق کی چشمِ شوق کو اس سے کوئی تعلق نہیں، ہاں اگر مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ عاشق و معشوق دونوں بندِ نقاب کھولنے میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرنے لگے تو بیشک درست ہو سکتا ہے لیکن اس مفہوم کی رکاکت ظاہر ہے۔ نیاز

(۳) پردہ رکھنا تھا جو منظور تو عاشق کے لئے الخ

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اگر عاشق کا پردہ رکھنا ہی منظور تھا تو پھر محبوب کو یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے دامن کو عاشق کا گریباں بنا دیتا کیونکہ پھر عاشق جنوں کی حالت میں بھی اپنے محبوب کے دامن کو تار تار کرنے کی جسارت نہ کرتا اور اس طرح اُس کا پردہ رہ جاتا، شاعر نے اس شعر میں یہ ادعا کیا ہے کہ عاشق کا پردہ رکھنے کے لئے "دامنِ یار" کو گریباں ہونا چاہئے تھا لیکن اس دعوے کا ثبوت کوئی نہیں پیش کیا گیا ہے ضرورت تھی کہ اس شعر میں کوئی نہ کوئی ایسا لفظ ہوتا جس سے ثبوت کی طرف اشارہ ہو جاتا۔ اُسلوب بیان میں بھی کوئی ندرت و تازگی نہیں۔ "پردہ رکھنا" بھی مبہم ہے۔ کس بات کا پردہ رکھنا؟

(۴) سُن کے افسانۂ غم باغ میں کمھلا گئے پھول شاق گزرا مجھے بُلبُل کا غزل خواں ہونا

بُلبُل کو جب پھولوں کی قربت میسر ہے تو اُس کی غزل خوانی کیوں "افسانۂ غم" کا رنگ اختیار کرے گی اور اُس کی غزل خوانی سن کر پھول کیوں کمھلائیں گے؟ اس کی کوئی شاعرانہ توجیہ پیش نہیں کی گئی۔

(۵) چاہئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا داغ ہر ایک بدر سا زخم ہر ایک ہلال سا

"آپ ہی کا جمال سا" میں "سا" مناسب جگہ پر استعمال نہیں ہوا ہے۔ یوں چاہئے تھا۔ "آپ ہی کا سا جمال" یہ بھی صحیح زبان نہیں ہے۔ "سا" کے بے موقع استعمال سے تعقید تو پیدا ہو گئی[1]

(۶) نگہِ شوق نے سب کھول دئے بندِ نقاب الخ

"بندِ نقاب" اگر دور بھی ہو جائیں تب بھی "حیا" جو ایک فطری کیفیت ہے باقی رہ سکتی ہے نہ "حیا" نقاب کی پابند نہیں ہے۔ "یا بندِ حیا" کی ترکیب بھی مناسب نہیں معلوم ہوتی۔

(۷) ہر وقت ایک خمار تھا ہر دم سرور تھا الخ

جب "اک خمار" کیا گیا تھا تو اچھا یہ تھا کہ "سرور" سے پہلے بھی "اک" استعمال کیا گیا ہوتا اس طرح تناسب باقی رہتا۔

(۸) جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا، الخ

جس دل کو لطف سے اپنا بنا لیا گیا اُس کے زخم تو مندمل ہو جانا چاہئے، اُس میں آزار زخم کیوں موجود فرض کیا گیا؟ اس کی شاعر نے کوئی توجیہ پیش نہیں کی۔ اس کے علاوہ "تھا" کی ردیف نے شاعر کے مفہوم کو کچھ سے کچھ بنا دیا اور شعر میں افعال کے بے محل استعمال سے چیستانی کیفیت پیدا ہو گئی۔

(۹) دل نہ تھا جان نہ تھی سوز نہ تھا ساز نہ تھا میں ہی میں تھا مرے ہمراہ کوئی راز نہ تھا

اس شعر میں سراسر تصنع و تکلف ہے۔ "انا" کا اتنا شدید تحقق، جان (نفس) کے بدون ممکن کیونکر ہے۔ یہ تو خود ایک راز ہے اس کی موجودگی میں دوسرے راز کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کی توجیہ کی ضرورت تھی۔ اگر سوز و ساز کا نہ ہونا ہی دل و جان کے عدم وجود کی نشانی ہے تو پھر "میں ہی میں تھا" کا کیا محل ہے؟ اب اگر اس میں کسی خاص مقام تصوف کی تصویر کشی کی گئی ہے تو بات دوسری ہے۔

(۱۰) بہت روکا تمہارے وعدۂ دیدار نے ورنہ الخ

اس شعر میں بھی شاعر اپنے زعم میں تصوف کے بحر ناپیدا کنار سے کوئی خاص الخاص موتی نکالنا چاہتا ہے مگر وہ اس میں کامیاب ہو سکا ہے۔ الفاظ سے جو اس شعر کا حاصل نکلتا ہے وہ بالکل ہی فضول ہے۔ اُس میں کوئی کیف نہیں۔

---

[1] ایک اور نقص یہ ہے کہ بدر میں تو خیر ہالہ کی تکمیل پائی جاتی ہے، لیکن ہلال میں یہ بات کہاں۔ ایک ہی وقت میں معشوق کے جمال کو بدر و ہلال سے تعبیر کرنا، تعبیر ناقص ہے۔ نیاز

---

(۱۱) خلوت میں غمِ فرقت اس طرح بیاں ہوتا الخ

اس شعر میں ردیف مناسب طور سے استعمال نہیں ہوئی۔ پہلے ٹکڑے سے تناسب کا تقاضا تھا کہ "ہوتا" کی جگہ "بنتا" استعمال کیا جاتا۔

(۱۲) تھی سیر اگر میں بھی ساتھ اُن کے وہاں ہوتا الخ

"وہاں" کا اشارہ دریا کی طرف ہے لیکن محبوب کی معیت میں عاشق کی آنکھ سے آنسو کیوں رواں ہوتے؟ اس کی توجیہ کی ضرورت تھی۔

(۱۳) جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے الخ

جیب و گریباں الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، اس لئے شعر بے معنی ہو جاتا ہے۔ جیب کے معنی اگر پاکٹ کے لئے جاتے ہیں تو شعر ورزشِ طفلانہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

(۱۴) زخم کو مرہم دل درد کو درماں سمجھا الخ

"دل" کا مناسب محل استعمال "زخم" کے بعد تھا۔ "مرہم" کے بعد "دل" ذرا زبردستی کی بات ہے

(۱۵) عشق کا راز وہی سوختہ ساماں سمجھا الخ

"جس نے دامن کبھی جانا" میں "جانا" کی جگہ "سمجھا" ہونا زیادہ مناسب تھا۔

(۱۶) تھا کھیل سا پہلے عشق لیکن جو کھلیں آنکھیں الخ

ردیف کھپنسی کھپنسی ہے، "پایا" زیادہ مناسب ہوتا "دیکھا" جو "کھلیں آنکھیں" سے ضرور مناسبت رکھتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے مضبوط نہیں[1]

(۱۷) اُس چشمِ غزالیں کو مے خانہ دل پایا الخ

"مے خانۂ دل" کے لئے "چشمِ غزالیں" یا "چشمِ غزال" مناسب نہیں ہے، اس صفت کا اضافہ بغیر کسی وجہ وجیہ کے ہے۔ میگوں، میگسار یا اس صفت کو ظاہر کرنے والی کوئی صفت ہونا چاہئے تھی[2]

(۱۸) اے نگاہِ یاس یہ کیا رنگِ محفل ہو گیا الخ

شاعر قاری کو جس منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے الفاظ اُس کی طرف رہنمائی نہیں کرتے۔ موقع و محل کا تقاضا ہے کہ "مرا دل" کے ساتھ کوئی اور لفظ بھی ہوتا جس سے مایوسی ظاہر ہوتی[3]

(۱۹) جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا الخ

"کچھ ظرف ہے" سے عالی ظرفی کی طرف اشارہ محاورہ میں کھینچا تانی کے بعد پیدا ہوتا ہے "ظرف" کے بعد "بھی" کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔

(۲۰) کھلے گا چارہ گر پر رازِ غم کیا درد کے ہوتے الخ

درد جب موجود ہے تو رازِ غم چارہ گر پر کیوں نہ کھلے گا۔ اس کی توجیہ دوسرے مصرعہ میں پیش کی گئی ہے مگر وہ بیکار ہے۔ "درد" اگر

---

[1] عشق کا قاف تقطیع سے خارج ہے۔ نیاز

[2] اس شعر میں ردیف کا استعمال بھی صحیح نہیں، دیکھا کا استعمال پایا کے مفہوم میں کیا گیا ہے۔ نیاز

[3] "دل کی طرف" دیکھنا بھی مہمل سی بات ہے۔ کیونکہ دل کوئی سامنے کی چیز نہیں جسے دیکھا جا سکے۔ نیاز

"نبض کی رفتار" بن جاتا ہے تو اُس سے نبض کی سابق رفتار باقی نہیں رہ سکتی - تغیر ضرور ہوگا - اب سوال یہ ہے کہ اس تغیر سے چارہ گر رازِ غم کیوں نہ پائے گا ؟

۲۱ - جس پر برس گئی کبھی برقِ جمالِ یار الخ

برق برستی نہیں چمکتی ہے - دوسرا مصرعہ بھی تغیر چاہتا ہے -

۲۲ - اللہ اللہ یہ کمالِ جذبۂ پنہانِ عشق الخ

شاعر کے عجزِ بیان نے شعر کا مفہوم اُلجھا دیا ہے - کس کی آنکھ سے آنسو گرا - عاشق کی آنکھ سے ؟ تو اُس آنسو کا حسن کا دریا ہو جانا "کمال جذبۂ پنہانِ عشق" کی وجہ سے عین موجہ سی بات ہے - "کمال جذبۂ پنہانِ عشق" نے کس راستہ سے یہ اثر پیدا کیا "پنہاں" کے اضافہ کی ضرورت کیا پیش آئی ؟ شعر سے ان ضروری باتوں کا پتا نہیں چلتا اور اگر معشوق کی آنکھ سے آنسو گرا تو اُسے تو حسن کا دریا ہونا ہی چاہئے اس میں "کمال جذبۂ پنہاں" کی کیا کرامت ہوئی - اور اگر جذبۂ پنہانِ عشق کا کمال یہ ہے کہ سنگِ دل معشوق کو اشکبار کر دیا اور یوں جو آنسو گر کر حسن کا دریا بنے تو یہ کمال جذبۂ پنہانِ عشق ہی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا مگر یہ بات "گئس کو باغ میں جانے نہ دینا" کے قسم کی چیز ہو جائے گی -

۲۳ - بڑھتے بڑھتے آفتابِ روزِ محشر بن گیا دل کی خاکستر میں اک شعلہ تھا جو بھڑکا ہوا

دل کی خاکستر میں بھڑکے ہوئے شعلہ کا وجود کہاں ؟

۲۴ - رگ رگ میں دل تھا دل میں نہاں سوز و ساز تھا

"سراپا گداز" ہونے کے لئے "سوز" کی ضرورت ہے - "ساز" کا اضافہ خواہ مخواہ کی بات ہے -

۲۵ - اللہ ری مجبوری آدابِ محبت الخ

گلشن اور گلستاں دو الگ چیزیں نہیں ہیں اس لئے گلشن میں رہ کر گلستاں کا نہ دیکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور پھر مجبوری آدابِ محبت کا یہ تقاضا کیونکر ہوا کہ گلستاں کو نہ دیکھا جائے اور پھر گلستاں میں تو بہت سی چیزیں ہیں - زیادہ سے زیادہ آدابِ محبت کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ بنظرِ پسندیدگی پھول کی طرف نظر نہ کی جائے، کیونکہ اس سے جذبۂ محبت محبوب کی توہین ہوگی اور اس طرح آدابِ محبت کی خلاف ورزی ہو جائے گی مگر اس حالت میں شاعر کو یوں کہنا چاہئے تھا :-

اللہ ری پابندیِ آدابِ محبت گلشن میں رہے حسنِ گلستاں نہیں دیکھا

اور اگر شاعر نے اپنی محبت کا متعلق گلشن ہی کو قرار دے لیا ہے اور کہنا یہ چاہتا ہے کہ میں گلشن کو محبوب رکھتا ہوں اور اس لئے میری محبت کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ گلشن کو نہ دیکھوں تو یہ تو بالکل ہی غیر فطری ادعا ہوگا - اگر گلشن ہی محبوب ہے تو اُس کی محبت کا تقاضا آدابِ محبت ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہی ہو سکتا ہے کہ اُس کی ہر چیز پر نظر رکھی جائے -

۲۶ - شریکِ نالہ میرا بھی جو اندازِ فغاں ہوتا الخ

اس شعر کا پہلا مصرعہ تعقید کا شکار ہو گیا ہے - کہنا یہ ہے " میرا اندازِ فغاں بھی جو شریکِ نالہ ہوتا" لفظوں کی ترتیب بہت ہی سقیم ہے "اندازِ فغاں" کی صفت میرا موصوف سے دور ہٹ گئی کیونکہ "فغاں" کی صفت میرا موصوف سے دور ہٹ گئی کیونکہ "فغاں" کے بعد جس "بھی" کو ہونا چاہئے تھا وہ "جو" کو لے کر بیچ میں آ گئی - اس کے علاوہ "اندازِ فغاں" کا شریکِ نالہ ہونا خود محلِ نظر ہے "اندازِ فغاں" کے لئے "شریک" ہونا صحیح نہیں -

آخر میں ایک اور بات - آپ نے نقد و نظر کے لئے جتنے اشعار پیش کئے ہیں اُن میں سے کوئی شعر بھی تو کسی بلند و عمیق جذبہ کا مالک نہیں ہے -

(عندلیب میرٹھی)

(۱) پہلے شعر کے مصرعِ آخر میں "چراغِ سحر" کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ "داغِ دل" مٹنے والا ہے اور عشق بھی روبہ زوال ہے۔ یہ خیال جذبۂ عاشقی کے خلاف ہے۔

(۲) دوسرے شعر میں "اُدھر جوشِ مستی، اِدھر چشمِ شوق" پڑھنا چاہئے یعنی "اِدھر" کی جگہ "اُدھر" اور "اُدھر" کی جگہ "ادھر" تاکہ "جوشِ مستی" معشوق کا سمجھا جائے اور "چشمِ شوق" عاشق کی۔

(۳) تیسرے شعر کے دوسرے مصرع میں "دامنِ یار کو" کی بجائے "دامنِ یار میں" کہا جائے تو "پردہ" کا مفہوم قایم رہے گا

(۴) چوتھے شعر کے دوسرے مصرع کو "شاق گزرا مرا بلبل کو غزلخواں ہونا" پڑھا جائے تو مطلب صاف ہو جائے گا۔[1]

(۵) پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں "سا" جمال اور ہلال سے پہلے ہونا چاہئے۔

(۶) چھٹے شعر میں "پابندِ حیا" کی ترکیب اس سے پیشتر کہیں نہیں دیکھی گئی۔

(۷) ساتویں شعر کا پہلا مصرعہ سرور و مستی کی کیفیت ظاہر کرتا ہے، لیکن دوسرے مصرع میں اس کا ثبوت "دلِ نا صبور" سے ناقص رہتا ہے۔[2]

(۸) آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں صرف "نشتر" کے لفظ سے شاعر کا مفہوم پورا نہیں ہوتا۔ شاید دوسرا مصرع اس طرح ہوتا تو مطلب پورا ادا ہو جاتا:۔ "اُس دل میں نشترِ غم پنہاں ضرور تھا"[3]

(۹) نویں شعر کے مصرعِ اولیٰ میں "دل نہ تھا، جان نہ تھی" بے معنی ٹکڑا ہے۔ اس کی جگہ مصرع یوں ہونا چاہئے:۔
"دل بھی تھا، جان بھی تھی، سوز نہ تھا ساز نہ تھا" ورنہ دل و جان کے بغیر اپنے وجود کا ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے شعر مہمل ہو جاتا ہے

(۱۰) دسویں شعر کے دوسرے مصرع میں "وہاں ہوتی نہ میری بیخودی" کی جگہ "وہاں ہوتی یہ میری بیخودی" ہونا چاہئے ورنہ شعر کا مطلب سمجھ میں نہیں آئے گا۔[4]

(۱۱) گیارھویں شعر کے دوسرے مصرع میں وہ "میری زبان بنتے" کی بجائے "وہ میری زباں ہوتے" کہنا چاہئے۔

(۱۲) تیرھویں شعر کے پہلے مصرع لفظ "جیب" استعمال ہوا ہے اور دوسرے میں "گریباں" حالانکہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

(۱۴) چودھویں شعر کے مصرعِ آخر سے طنز کا اظہار ہوتا ہے، حالانکہ پہلے مصرع کے پیشِ نظر اس کا کوئی موقع نہیں۔

(۱۵) پندرھویں شعر کا مصرعِ ثانی فصاحت اور روانی کے لحاظ سے یوں ہونا چاہئے:۔
"جس نے دامن کبھی سمجھا، نہ گریباں سمجھا"

(۱۶) سولھویں شعر کے دوسرے مصرع میں "وہ تیرِ نظر" کی بجائے "اک تیرِ نظر" ہونا چاہئے۔

(۱۷) سترھویں شعر کے مصرعِ اول میں "میخانۂ دل" کھٹکتا ہے۔ "فردوسِ نظر" کے جوڑ کا کوئی دوسرا لفظ "میخانۂ دل" کی جگہ نظم کیا جاتا تو مناسب ہوتا۔

(۱۹) اُنیسویں شعر کے دوسرے مصرع میں "رازِ میخانے سے باہر نہ ہو" کی جگہ "رازِ میخانے کے اندر رہے" ہونا چاہئے کیونکہ "راز کا باہر ہونا" خلافِ روزمرہ ہے۔ علاوہ ازیں "ظرف" کی وسعت لفظ "اندر" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

---

[1] اصلاح معقول ہے۔ نیاز۔ [2] اگر بوتل کا صرف بغل میں ہونا سرور کے لئے کافی ہو سکتا ہے، تو بھی "دلِ نا صبور" کی بوتل یہ فرض انجام نہیں دے سکتی، اس کے لئے "دلِ غیر نا صبور" کی ضرورت ہے۔ نیاز۔ [3] اصلاح مناسب ہے۔ [4] اصلاح خوب ہے۔ نیاز

(۲۰) بیسویں شعر میں بظاہر کوئی نقص معلوم نہیں ہوتا۔

(۲۱) اکیسویں شعر کے مصرعِ اولیٰ میں "برق" کے ساتھ "برسنا" لکھا ہے، حالانکہ "چمکنا" ہونا چاہئے۔ اس لئے یہ مصرع یوں پڑھا جائے ع "جس پر چمک گئی کبھی برقِ جمالِ یار"۔ دوسرے مصرع میں "اس کے مزار" کی جگہ "خاکِ مزار" ہونا چاہئے تاکہ "در" کا لفظ "مزار" کے ساتھ اکھڑا اکھڑا نہ معلوم ہو۔ اور پھر "اُس کے" کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(۲۲) بائیسویں شعر کے مصرعۂ ثانی میں "جوگرا" مناسب نہیں ہے۔ "جو بہا" ہونا چاہئے۔

(۲۳) تیئیسویں شعر کے دوسرے مصرع میں "اِک شعلہ تھا" کی جگہ "اِک اخگر تھا" ہونا چاہئے کیونکہ "خاکستر" میں "شعلہ" نہیں ہوتا "اخگر" ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جب "شعلہ" "خاکستر" میں نہیں ہوتا تو "اخگر" کے لئے "بھڑکنا" بھی کسی طرح جائز نہیں۔ اسلئے کہ "بھڑکا ہوا" کی جگہ "لپٹا ہوا" کچھ بہتر ہوگا۔

(۲۴) چوبیسویں شعر کے پہلے مصرع میں "سوز و ساز" کا ٹکڑا نامناسب ہے۔ اس کی جگہ "دل کا راز" ہونا چاہئے تاکہ شعر کا مطلب واضح ہو جائے۔

(۲۵) پچیسویں شعر کے مصرعِ اولیٰ میں "مجبوریِ آدابِ محبت" کی بجائے "پابندیِ آدابِ محبت" ہونا چاہئے کیونکہ "آدابِ محبت" کے لئے "مجبوری" نہیں بلکہ "پابندی" مناسب ہے۔

(۲۶) چھبیسویں شعر کے مصرعِ اولیٰ میں "نالہ" کی جگہ "درد" ہونا چاہئے کیونکہ "شریکِ درد" سے مراد ہمدردی ہے اور "شریکِ نالہ" سے مقابلہ کرنے کا مفہوم نکلتا ہے۔ پھر "فغاں" تو خود "نالہ" ہے، اس لئے "درد" ہی زیادہ بہتر ہے۔ دوبارہ "فغاں" یا "نالہ" کہنا کسی طرح موزوں نہیں۔

(فرمانؔ فتحپوری)

(۱) "کچھ امید" وضاحت کی محتاج ہے۔ مضمون تو پامال تھا ہی اسلوب بھی بے جان ہے۔ "چراغِ سحر" کے لئے رفتہ رفتہ کی شرط بے کار ہے۔ محاورہ نظم ہو گیا مگر مفہوم پورا نہ ہوا۔

(۲) "اِدھر جوشِ مستی" "اُدھر چشمِ شوق" کا تماشا بھی عجیب و غریب ہے اگر "اِدھر" "اُدھر" کو کتابت کی غلطی سمجھا جائے تو "مصیبت میں بندِ نقاب آگیا" کو کس طرح گوارا کیا جائے "مصیبت میں پڑ جانا" یا "پڑنا" بولتے ہیں "مصیبت میں آنا" ان معنوں میں نہیں سنا گیا۔ "بندِ نقاب" کا مصیبت میں آنا یوں بھی مہمل ہے۔ جذبۂ حیا کوشی یا شوق نقاب پوشی کا مصیبت میں پڑ جانا مصرعِ اولیٰ سے سمجھ میں آتا ہے لیکن "بندِ نقاب" کا مصیبت میں پڑنا عجیب بات ہے۔

(۳) نثر یوں ہوتی ہے۔ جو پردہ رکھنا منظور تھا تو دامنِ یار کو عاشق کے لئے گریباں ہونا لازم تھا۔ مہمل مضمون ہے۔ اس ادعا کو کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ "دامنِ یار کو لازم تھا گریباں ہونا" اور اگر ایسا ہو بھی تو پردہ کیسے رہ جاتا، اس صورت میں تو عاشق و معشوق دونوں کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

(۴) دونوں مصرعے نامربوط ہیں۔ بلبل، غم خواں تھا تو افسانۂ غم کا کیا سوال۔ اور اگر ہو بھی تو کس کے غم کا افسانہ تھا کہ پھول بھی کمھلا گئے اور شاعر کو بھی شاق گزرا۔ کوئی مفہوم نہیں پیدا ہوتا۔

(۵) "چاہئے" میں "ی" کا اشباع ناگوار ہے۔ داغ و زخم خواہ بدر ہو جائیں یا ہلال آن میں دوست کا جمال کہاں۔ پھر اس قصور سے جمالِ دوست کی تنقیص ہوتی ہے جو شاعر کا مقصود نہیں ہو سکتا۔

(۷) محض بغل میں بوتل دبائے رہنے سے سرور و قمار کی کیفیتیں نہیں پیدا ہو سکتیں اس لئے دل کو بوتل کہنا اور "دلِ ناصبور کو" بوتل سے تشبیہ دینا مہمل ہے۔

(۸) اگر "اُس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا" تو بھی بات کیا ہوئی۔ علاوہ اس کے اس دعویٰ کے لئے کوئی قرینہ ہونا چاہئے تھا۔

(۹) "راز" کا ہمراہ ہونا بالکل نعوبات ہے۔ دوسرے، دل۔ جاں۔ سوز اور ساز کو راز سے تعبیر کرنا درست نہیں، دوسرے مصرعہ میں "ہم راز" ہونا چاہئے تھا مگر شاعر نے "راز" کہکر شعر کو بے معنی کر دیا۔

(۱۰) نثر یہ ہے۔ تمہارے وعدۂ دیدار نے بہت روکا ورنہ میں جہاں ہوتا وہاں میری بیخودی بھی نہ ہوتی۔ شاعر کہاں ہوتا اور اسکی بے خودی کہاں ہوتی، اسے صرف شاعر ہی سمجھ سکتا ہے۔

(۱۱) "میں اُن کی زباں بنتا وہ میری زباں بنتے"۔ ایک دوسرے کی زبان بننا نہ کوئی محاورہ ہے اور نہ ایسا ہو جانے سے شاعر کا مافی الضمیر واضح ہوتا ہے۔

(۱۲) اول تو "وہاں" کا مشار الیہ ملتا نہیں۔ اور اگر "سیر" کی مدد سے دریا کو وہاں کا مرجع گردانا جائے تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ دریا کے ساتھ آنسو رواں ہونے سے "سیر" کا لطف آجاتا۔ آنسوؤں کا جاری ہونا تو سیر و تفریح کے منافی ہے۔

(۱۳) جنوں میں جیب کے ٹکڑوں کو سینے بیٹھ جانا۔ احترام جنوں کے خلاف ہے اور اگر ہو بھی تو "جیب" سیا جاتا ہے نہ کہ جیب کے ٹکڑے جیب کے ٹکڑے سینا جیب سینے کے مرادف نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی گریباں کو تار تار جان کر بھی جیب سینے بیٹھ جائے تو اس میں استعجاب کی کیا بات ہے۔ معلوم نہیں شاعر کیا نئی بات پیدا کرنا چاہتا ہے۔

(۱۴) جب زخم کو "مرہم دل" اور درد کو درماں سمجھا گیا تو پھر بیماری کونسی قرار پائی۔ علاج سمجھنا محاورہ نہیں ہے۔

(۱۵) دامن جاننا اور گریباں سمجھنا۔ شاعر کی اختراع ہے۔ ان ترکیبوں سے یہ مفہوم پیدا کرنا کہ "دامن و گریباں کی پروا نہیں ہے" کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے پھر شاعرانہ ادعا کے لئے استدلال کی ضرورت ہے کہ عشق کا راز وہی سوختہ ساماں کیوں سمجھتا ہے جو نہ دامن سمجھتا ہے نہ گریباں۔

(۱۶) "تیرِ نظر" کا رگ رگ میں چبھے ہونے اور پیوست ہونے کے بجائے ڈوبا ہونا مہمل ہے۔

(۱۷) فردوسِ نظر پایا کے بجائے فردوس نظر دیکھا لکھا گیا ہے جس سے شعر بے معنی ہو گیا۔

(۱۸) دوسرے مصرع میں جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ بغیر کسی استدلال یا قرینے کے ہے دوسرے یہ کہ پہلے مصرع میں جو استعجابی اظہار ہے وہ بھی بے کیف و بے روح ہے، شعر میں محض تصنع اور آورد ہے۔

(۱۹) مصرع اول میں ردیف "کا" کے بجائے "میں چاہئے" مگر مطلع بنانا تھا شاعر نے "کا" لکھدیا۔ یہ شعر دوسرے تمام اشعار کے مقابلہ میں بہ اعتبار مضمون غنیمت ہے۔

(۲۰) معلوم نہیں درد میں عاشق مبتلا ہے یا خود چارہ گر۔ دوسرے مصرعہ میں "اُسے" کا لفظ "درد" کے لئے استعمال ہوا ہے یا چارہ گر کے لئے کچھ پتہ نہیں۔ دونوں صورتوں میں شعر بالکل مہمل ہے۔

(۲۱) برق کا چمکنا۔ تڑپنا۔ گرنا۔ ٹوٹنا سنا تھا۔ برسنا نہیں سنا۔ دوسرے مصرع میں دعویٰ بغیر دلیل کے پیش کیا گیا ہے۔

(۲۲) آنسو گرنے سے حسن کا دریا بھی ابل پڑتا ہے۔ یہ معلوم نہ تھا۔

(۲۳) خاکستر میں چنگاری رہ جاتی ہے نہ کہ شعلہ اور پھر معلوم نہیں وہ کس طرح آفتاب روز محشر بن گیا۔

(۲۴) رگ رگ میں دل تھا یہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن ان میں سوز کے بجائے ساز بھی تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا اور تعجب ہے کہ ساز کے ہوتے ہوئے بھی شاعر سراپا گداز ہے۔ عاشق کا سراپا گداز ہونا آج ہی سنا ہے۔ (۲۵) گلشن اور گلستاں دو مختلف چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے آداب محبت کے بجائے محبوس محبت یا اسیر محبت وغیرہ جیسی ترکیبیں لانی تھیں۔ (۲۶) پہلے مصرعہ میں لفظی تعقید کے علاوہ یہ عیب بھی ہے کہ دعویٰ کیلئے دلیل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

دعوتِ نقد و نظر

(دوسری قسط)

جس شاعر کے اشعار طلب رائے کے لئے اکتوبر ۵۳ء میں شایع کئے گئے تھے، اس کے چند اشعار اور شایع کئے جاتے ہیں۔ کوشش کیجئے کہ اپریل کی اشاعت میں آپ کی رائے شامل ہو سکے۔ نیاز

۱- چشمِ طلب میں اور کوئی آشیاں سہی اب — میرے لئے، قفس مجھے سارا جہاں ہے اب

۲- دل کی کیا تاب کہ پہونچے صفِ مژگاں کے قریب — جلوے خود لوٹ رہے ہیں رخِ تاباں کے قریب

۳- تابِ دیدارِ رخِ یار، کہاں سے لاؤں — گر پڑی جا کے نظر گوشۂ داماں کے قریب

۴- دیکھئے، میری تمناؤں کا احساس رہے — باغِ فردوس میں تنہا نہ چلے جائیں آپ

۵- میری رگ رگ میں سما کر بھی، یہ پردہ مجھ سے — ظلم ہے ظلم، جو آئینے سے شرمائیں آپ

۶- بہ سرِ لطف، وہ شوخ ستم ایجاد ہے آج — نالہ بھی، نالہ ہے، فریاد بھی فریاد ہے آج،

۷- ذرّے ذرّے سے نمایاں شانِ قدرت دیکھ کر — کھل گئیں آنکھیں، طلسمِ حسنِ فطرت دیکھ کر

۸- یہ ہجومِ غم، یہ اندوہِ مصیبت دیکھ کر — اپنی حالت دیکھتا ہوں، اُن کی صورت دیکھ کر

۹- عمر بھر کا ساتھ، رنج و غم میں دے سکتا ہے کون — شمع بھی رخصت ہوئی، میری مصیبت دیکھ کر،

۱۰- لالہ و گل کو دیکھتے، کیا، یہ بہار دیکھکر، — رہ گئے بیخودی میں ہم، صورتِ یار دیکھکر،

۱۱- وہ چمن، میرا چمن ہے، وہ قفس میرا قفس — جس کے گوشے گوشے میں صدہا چمن صدہا قفس،

۱۲- میں وہ غیرت مند بلبل تھا، دکھایا پھر نہ منھ — بوئے گل آ آ کے ڈھونڈا کی قفس سے تا قفس،

۱۳- فرصت کہاں کہ چھیڑ کریں آسماں سے ہم، — لپٹے پڑے ہیں لذتِ دردِ نہاں سے ہم،

۱۴- بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا، — آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

۱۵- اللہ ری حسن و عشق کی سحر آفرینیاں — خوش ہو رہے ہیں گھر کا گھروندا بنا کے ہم

۱۶- کس کس پہ جان دیجئے، کس کس کو چاہئے؟ — گم ہو گئے ہیں بزمِ تمنا میں آ کے ہم

۱۷- دم گھٹا جاتا ہے، اے دستِ جنوں، — چاکِ دامانِ سحر دیکھوں میں،

۱۸- اُس کوچے میں ہوں صورتِ یک نقشِ وفا میں — دنیا نے مٹایا مجھے، لیکن نہ مٹا میں

۱۹- سراپا آرزو ہوں، درد ہوں، داغِ تمنا ہوں — مجھے دنیا سے کیا مطلب، کہ میں آپ اپنی دنیا ہوں

۲۰- مجھی میں حسن کا عالم، مجھی میں عشق کی دنیا — نثار اپنے پہ ہو جاؤں اگر سو بار پیدا ہوں

۲۱- دستِ جنونِ عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ — ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

۲۲- رگ رگ میں دل ہے، دل میں تڑپ دردِ عشق کی — محشر بنا ہوا ہوں تمنائے یار میں

۲۳- چھوڑا نہ تپِ عشق نے کچھ بھی کسی گھر میں — دل سے جو لگی آگ، بجھی جا کے جگر میں

۲۴- اب شمع بھی بجھتی ہے، مرا دم بھی لبوں پر — کیا دیر ہے یارب! شبِ فرقت کی سحر میں

۲۵- کچھ یہ کہ عرضِ شوق کی طاقت نہیں مجھے، — اور کچھ یہ ہے، کہ مصلحتِ یار بھی نہیں

۲۶- وہ دل، کہ جس پہ حرفِ تمنا بھی بار تھا — اب صرفِ شکوہ سنجیِ اغیار بھی نہیں

۲۷- خوفِ صیاد سے عالم ہے یہ بیتابی کا، — کہ ابھی ہوں تو ابھی صحنِ گلستاں میں نہیں

۲۸- ڈوب کر دل میں وہ نظریں سرو پیکاں ہوگئیں — رہ گئیں جو دل کے باہر نشترِ جاں ہوگئیں،

۲۹- حسن کی شاخیں تھیں جتنی سب نمایاں ہوگئیں — جو ترے رخ سے بچیں رنگِ گلستاں ہوگئیں

۳۰- دھجیاں باقی ہیں جتنی، اب مرے کس کام کی — جو گریباں ہونے والی تھیں گریباں ہوگئیں

۳۱- دل کی تسکیں کے لئے دو پھول دامن میں نہیں — اس طرح ہوں آج گلشن میں کہ گلشن میں نہیں

۳۲- چین اسیرانِ قفس کو یادِ گلشن میں نہیں، — دوڑتی ہیں بجلیاں سیلابِ خوں تن میں نہیں

۳۳- دید کے قابل ہے یہ رنگِ سبک روحی مرا، — ڈھونڈھتی ہے برق مجھ کو، میں نشیمن میں نہیں

۳۴- کیوں خزاں میں سر جھکائے مضمحل بیٹھا رہوں — میری نظروں میں تو ہیں جو پھول گلشن میں نہیں

۳۵- اشارہ ہے کسی کی اک نظر کا — وگرنہ، کیا ہے جانِ ناتواں میں

۳۶- یہ رنگِ اتحاد! اللہ اکبر، — شبیہِ دل ہے، ہر اشکِ رواں میں

۳۷- جرس کے بھی جو اٹھکر ہوش کھو دیں — وہ نغمے ہیں مرے سازِ فغاں میں

۳۸- ٹھیس لگ جائے نہ اُن کی حسرتِ دیدار کو — اے ہجومِ غم! سنبھلنے دے ذرا بیمار کو

۳۹- وفورِ کیف سے دل، اتنا بے قرار نہ ہو، — میں ڈر رہا ہوں، کہ مضطر نگاہ یار نہ ہو،

۴۰- بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے — یہ کیا مجال، جہاں میں ہوں، اور بہار نہ ہو

۴۱- خیالِ وصل سے کر تو رہا ہوں کچھ باتیں، — قریب ہی کہیں لیکن نگاہ یار نہ ہو

۴۲- رخ پہ جھولکوں سے جو وہ زلفِ دوتا پھرتی ہے — کیسی بل کھائی ہوئی بادِ صبا پھرتی ہے

۴۳- اللہ رے تیغ عشق کی برہم مزاجیاں، — میرے ہی خونِ شوق میں نہلا دیا مجھے

۴۴- خوش ہوں کہ حسنِ یار نے خود اپنے ہاتھ سے — اک دل فریب داغِ تمنا دیا مجھے

۴۵- دنیا سے کھو چکا تھا مرا جوشِ انتظار — آوازِ پائے یار نے چونکا دیا مجھے

۴۶- کیا خبر تھی خلشِ ناز نہ جینے دے گی، — یہ تری پیار کی آواز نہ جینے دے گی

۴۷- قہر کی لاکھ نگاہوں کی ضرورت کیا ہے! — لطف کی اِک نگہِ ناز نہ جینے دے گی

۴۸- مسلکِ عشق مرا مجھ کو نہ مرنے دے گا — تیری شوخی، ستمِ ناز نہ جینے دے گی

۴۹- کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی — آہ کر کے وہیں بیٹھ گیا، دردِ جگر بھی

۵۰- پھر گئی اُن کی نظر پھر گئے دنیا سے وہ — دوستیِ جسم و جاں، اب نہ نبھی جائے گی

۵۱- خاک ہے جذبِ عشق کی تاثیر — خامشی ہی جو گفتگو نہ کرے

۵۲- عاشقی یاس کی محکوم ہوئی جاتی ہے — بیکسی اب مرا مفہوم ہوئی جاتی ہے

۵۳- دل ہوا خاک تپِ غم سے مگر دل کی جگہ — اک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

۵۴- دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں — کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے،

۵۶- دل تھا ترے خیال میں پہلے چمن چمن — اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

۵۷- نگاہِ قہر کے صدقے، جھکی نہ غیر کی سمت — مجھی پہ تیز ہوئی یہ، مجھی پہ لال ہوئی،

باب الاستفسار

(دجّال)

(اسلام ظفر صاحب - چاٹگام)

ازراہ کرم مطلع فرمائیے کہ دجّال کے متعلق مسلمانوں کا صحیح عقیدہ کیا ہے اور اسلامی لٹریچر میں کیا روایات اس کی بابت پائی جاتی ہیں۔

(نگار) دجّال بالکل خرافیاتی چیز ہے اور عقاید اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بات یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو خرافیات اور اصنامی روایات سے پاک ہو، یہاں تک کہ اسلام ایسا سادہ مذہب بھی انسان کی اعجوبہ پرستیوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور اس کے معتقدات میں بہت سی ایسی روایات شامل ہوگئیں جو معقولات کیا مستند منقولات سے بھی تعلق نہیں رکھتیں۔

انھیں میں سے وہ روایات بھی ہیں جو دجّال کے بیان سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر عجیب وغریب ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، ہمارے اکابر نے کیونکر ان کا یقین کیا اور کیوں اپنی کتابوں میں ان خرافیات کو جگہ دی۔

دجّال تقریباً وہی ہے جسے بائبل کی زبان میں Anti christ (ضدّ مسیح) کہتے ہیں اور چونکہ اوائل اسلام میں مسیحی ویہودی روایات نہایت آزادی سے قبول کرلی جاتی تھیں، اس لئے منجملہ دیگر قصص وحکایات کے جنھیں "اسرائیلیات" کہتے ہیں، دجّال کی کہانی بھی مسلمانوں میں رواج پاگئی۔

یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ عربوں میں دجّال کی روایت کن کن واسطوں سے پہونچی اور ان میں کیا کیا اضافے ہوئے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے بڑے بڑے مورخین نے صحیح باور کرکے ان کا ذکر کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر آج کوئی مسلمان دجّال کے وجود سے انکار کردے تو اس کو آسانی سے دہریہ وملحد قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ سوال اس کا نہیں ہوتا کہ بجائے کوئی روایت، قابل قبول ہے یا نہیں بلکہ صرف یہ چیز سامنے ہوتی ہے کہ ہمارے اکابر جو کچھ لکھ گئے ہیں، وہ غلط ہونے کے باوجود، کیونکر غلط ہوسکتا ہے اور ہم کیونکر اس سے انکار کی جرأت کرکے مسلمان رہ سکتے ہیں۔

بہرحال دجّال کے متعلق جو روایات ہمارے مورخین نے بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

(۱) دجّال سلطنتِ مہاراج یا رانج (جاوا) کے جزیروں میں سے ایک جزیرہ میں رہتا ہے۔

(۲) سیراف اور عمان کے بحری سیاحوں کا بیان ہے کہ اس جزیرہ کے پاس سے گزرتے ہوئے عود، طنبور اور دوسرے سازوں کے ساتھ نغمہ وسرود کی دلکش آوازیں اس طرح سنی ہیں جیسے کوئی تالی بجا بجا کر ناچ رہا ہو۔ یہ روایات ابن خورداذبہ، البیرونی، قزوینی، دمشقی، جرجانی مسعودی، وغیرہ کی تمام تاریخی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

سندباد (سیاح) کے سفرنامہ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے اور ابن خورداذبہ نے تو اس جزیرہ کا نام بھی "برطائیال" متعین کردیا ہے یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہاں لونگ کی تجارت ہوتی ہے، لیکن جن لوگوں سے لونگ لی جاتی ہے وہ کبھی نظر نہیں آتے، خرید وفروخت کی صورت

یہ ہوتی ہے کہ اس جزیرہ کے باشندے اپنا مال جزیرہ کے ساحل پر رکھدیتے ہیں اور باہر کے سوداگر جس جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے لے لیتے ہیں اور انکے عوض اپنا مال رکھ کر چلے آتے ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دجال سمندر کے درمیان ایک چٹان سے بندھا ہوا ہے اور دیو اس کی خوراک بہم پہونچاتے ہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ روایت یہ ہے کہ تمیم الداری جو رسول اللہ کا ہم عصر تھا، دجال سے مل بھی چکا تھا۔

الغرض یہ تو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک دیو ہے، لیکن اس کے متعلق اختلاف ہے کہ وہ کہاں اور کس صورت میں نمودار ہوگا۔ ابن الوردی کا بیان ہے کہ وہ رسول اللہ کا ایک ہمعصر یہودی سیف بن صائد ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ایک ساحر (مشق) کا لڑکا ہے۔

طبری کا بیان ہے کہ وہ ایک دیو ہے ذوالقرنین کے قسم کا جو یہودیوں کے بادشاہ کی حیثیت سے ایک دن تمام دنیا پر حکمرانی کرے گا اسی سلسلہ میں طبری نے یہودیوں کی بعض اور روایات بھی درج کی ہیں جن میں اس بات کی پیش گوئی کی گئی ہے کہ جب دنیا میں یاجوج ماجوج کا ظہور ہوگا تو دجال ایک گدھے پر سوار ہوکر خروج کرے گا، اس کی حکومت صرف ۴۰ دن رہے گی لیکن وہ اتنی ہی فرصت میں شرق سے لیکر غرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر جگہ چھا جائے گا، یہاں تک کہ مسیح اور مہدی موعود رونما ہوں گے، اور مہدی اسے ہلاک کردیں گے۔ صاحب طبری نے اس کا نام عبداللہ الصیائید ظاہر کیا ہے۔ البیرونی اور ابن الوردی کی روایت کے مطابق وہ کوفہ یا اصفہان سے خروج کرے گا۔

آئندہ سالنامہ ۵۵ء (علماءِ اسلام نمبر)

ایک صفحہ کا اقتباس

عبدالرحیم خاں (خانخاناں) - ولادت (لاہور) ۱۴ صفر ۹۶۴ھ / ۱۶ دسمبر ۱۵۵۶ء = وفات (دہلی) ۱۰۳۶ھ / ۱۶۲۷ء

اپنے ہم عصر امراء میں خان مرزا کے نام سے مشہور تھا۔ اکبر کے پہلے وزیر بیرم خاں کا بیٹا تھا، اس کی ماں جمال خاں میواتی کی بیٹی تھی۔ ۴ سال کی عمر تھی کہ اس کا باپ بیرم خاں قتل کیا گیا اور اکبر نے اس کی پرورش کی۔ ۹۸۰ھ / ۱۵۷۲ء میں بہ عمر سولہ سال اکبر کے ساتھ گجرات گیا اور ضلع پٹن اس کو جاگیر میں دیا گیا۔ جنگ سرنال میں اس نے بقرہ (باغی) کی سرکوبی کی۔ ۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء میں گجرات کا گورنر مقرر ہوا۔ ۹۸۸ھ / ۱۵۸۰ء میں میر عرض کے عہدہ پر ممتاز ہوا اور تین سال بعد شاہزادۂ سلیم کا اتالیق مقرر ہوا۔ ۹۹۱ھ / ۱۵۸۳ء میں شاہ مظفر گجراتی کی سرکوبی کے لئے مامور کیا گیا اور اس نے سرکچ اور نادوت کی لڑائیوں میں مظفر کا زور ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ اس کے صلہ میں اکبر نے اسے خانخاناں کا خطاب دیا۔ ۹۹۶ھ / ۱۵۸۹ء میں اس نے بابرنامہ کا فارسی ترجمہ پیش کیا اور جونپور کا گورنر مقرر ہوا۔ ۹۹۹ھ / ۱۵۹۱ء میں جب ملتان اور بھکر کی گورنری اس کو عطا ہوئی تو جانی بیگ ارغون کو شکست دیکر سندھ بھی اس نے مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا۔ ۱۰۰۵ھ / ۱۵۹۷ء میں اس نے بیجاپور کی مہم میں بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس کے دو سال بعد شاہزادۂ دانیال کی معیت میں احمد نگر پر حملہ کیا اور چاند بی بی کے خلاف فوج کشی کی۔ جہانگیر کے عہد میں یہ شاہزادۂ خرم کے ساتھ ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء میں پھر دکن کی جنگوں میں شریک ہوا۔

یہ عہدِ مغلیہ کا بڑا مشہور صاحب سیف وقلم امیر تھا اور شعراء کی بڑی قدر کرتا تھا اور خود بھی عربی، ترکی، فارسی اور ہندی زبان کا ماہر تھا اور شاعری کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتا۔ فارسی میں رحیم تخلص کرتا تھا اور ہندی میں رحمن۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی اسی کے نام سے منسوب کی تھی۔

حوالہ جات :- مآثر رحیمی - مآثر الامراء (شاہنواز خاں) - اکبرنامہ (ابوالفضل) - طبقات اکبری (نظام الدین احمد)

اسی انداز سے سیکڑوں اکابر علم وادب کا تذکرہ سالنامہ میں درج ہوگا۔ منیجر

خمریات دلؔ شاہجہاں پوری :-

تمنائے کرم اس کیف پر کچھ اور کہتی ہے ـــــ چھلک جاتا ہے جب ساغر نظر کچھ اور کہتی ہے
ہے مشربِ رنداں میں اندازِ طلب یہ بھی ـــــ ہر گردشِ ساغر پر اک نعرۂ مستانہ
صبا بیخود، فضا سرشار، ساقی غرقِ مدہوشی ـــــ رہیں گی تشنۂ بادہ مری انگڑائیاں کب تک
تصویرِ خلد کھنچ گئی۔ ساقی کی بزم میں، ـــــ ہر جام میں بہار کے آثار دیکھ کر
زاہد ہوا نہ اس کی حقیقت سے آشنا ـــــ جنت کا ایک پھول ہے۔ ساغر کہیں جسے
چشمِ ساقی۔ روحِ بادہ۔ روحِ بادہ زندگی ـــــ اس نظر سے پینے والا بے نیازِ جام ہے
رہیں گے مستِ تمنا۔ شراب ہو کہ نہ ہو ـــــ ملے تو ہمتِ ساقی۔ اگر نہیں نہ سہی
بھلا سا نام ہے اُس کا۔ اُسے کیا کہتے ہیں زاہد ـــــ صراحی سے جو ڈھلتی ہے جو میخانوں میں ہوتی ہے
لے لیا دورِ صبوحی کے لئے حکمِ جواز ـــــ میکدے میں کسی مخمور کی انگڑائی نے
اے احترامِ ساقیِ محفل سنبھالنا ـــــ لغزش ہوئی ہے ساغر و مینا لئے ہوئے
بہارِ جام بکفِ جھومتی ہوئی آئی، ـــــ شکستِ عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے
تری فردِ عمل ہو پاک اس عصیاں سے لے واعظ ـــــ کوئی پیتا ہے۔ پینے دے۔ کہیں ڈھلتی ہو ڈھلنے دے

اک رند ابھی اے دل کہتا ہوا گزرا ہے
صد زہد ہے یک جرعہ نذرِ مے و میخانہ

اکرمؔ دھولیوی :-

حسرت بدل گئی نہ طبیعت بدل گئی ـــــ احساسِ آرزو کی لطافت بدل گئی،
تسکینِ دل کے واسطے آئی جب اسکی یاد ـــــ دم بھر کو آنسوؤں میں محبت بدل گئی
یا بڑھ گئی کشاکشِ حرمان و آرزو ـــــ یا صدمۂ فراق کی لذت بدل گئی
فطرت کا سلسلہ تھا جنوں سے ملا ہوا ـــــ رخصت ہوئی بہار طبیعت بدل گئی
بیگانہ وش رہے وہ محبت کے باب میں ـــــ پھر بھی کہیں کہیں سے حکایت بدل گئی

کبھی ہو سکے نہ وہ سرخرو جو نظر سے تیری اُتر گئے ـــــ جنھیں تیرے دل میں جگہ ملی وہ نکھر گئے وہ سنور گئے
تھا چمن تمام بہار پر تھا نکھار چاروں طرف مگر ـــــ کسی غم نصیب کو کیا خبر وہ خوشی کے دور کدھر گئے
جنھیں ہے زمانے کا تجربہ کچھ انھیں سے پوچھ یہ ماجرا ـــــ کہ غم و الم کا تو ذکر کیا وہ خوشی کے نام سے ڈر گئے
جو بڑھے یقین حیات پر وہی پہونچے اوج ثبات پر ـــــ جنھیں شک تھا اپنی ہی ذات پر وہ فنا کے گھاٹ اُتر گئے
ترے عشق میں تری چاہ میں ترے شوق میں تری راہ میں ـــــ کئی منزلیں ابھی اور ہیں کئی منزلوں سے گزر گئے

انتخاب کلام رضوی :-

اس کی شگفتگی کو نئی فصل چاہئے
تحلیل ہوگیا نگہِ آفتاب میں

دل ہے وہ فتنہ جو ابھی برپا نہیں ہوا
وہ ذرۂ حقیر جو صحرا نہیں ہوا

نہیں ایسا کہ کبھی شوق پر افشاں، بھی نہیں
شوق افسردہ کا مجھ سے نہ گلہ کر کہ مجھے،
جلوہ آباد تصور ہ اداکاریِ شوق،
کائنات اپنی ہمیں دے کے بھی فارغ نہیں آپ
کب سے میخانۂ رضوی نہیں آیا ہے نظر

دل کو تھا ناز کہ ویراں ہے سو ویراں بھی نہیں،
اعتبارِ کرمِ جنبشِ مژگاں بھی نہیں،
اب تو مرہون فسوں سازیِ جاناں بھی نہیں
ہم تو کچھ مدعیِ وسعتِ داماں بھی نہیں
اِس خزاں دوست کو کچھ شرم بہاراں بھی نہیں

نکل چلی بن کے اک بگولا ہجوم کرو بیاں سے آگے
چمن اسے اتفاق کہہ لے گری تو ہے آشیاں پہ بجلی

جو گرد تھی کارواں سے پیچھے وہ بڑھ گئی کارواں سے آگے
نہ دو قدم آشیاں سے پیچھے نہ دو قدم آشیاں سے آگے

فغاں جو بیگانۂ طپش ہے وہ روشناسِ اثر بھی ہوگی؟
نہ چاند تاروں کی انجمن سے وفا کے پیماں کرکے بیٹھیں
شعائیں کچھ نرم و گرم رضوی ہمارے دل پر چمک رہی ہیں

شجر سے جو شاخ کٹ چکی ہے وہ کیا کبھی بار ور بھی ہوگی
یہ کہر و شب کے پجاریوں سے کہ دو گھڑی میں سحر بھی ہوگی
ابھی تو گویا سحر ہوئی ہے چڑھے گا دن دوپہر بھی ہوگی

تماشا آسماں تک ہے تصور آستاں تک ہے
کہیں یہ چار تنکے جل کے خاکستر بھی ہو جائیں،
اُنڈیلے جا مئے مینا گدازِ جلوہ اے ساقی
تماشا اور تحیر میں کوئی نسبت نہیں رضوی،

مگر شوقِ دلِ بے تاب کیا جانے کہاں تک ہے
کہ اب کھٹکا چمن کو بس وجودِ آشیاں تک ہے
کہ ضبط تندیِ صہبا اسی وطنِ گراں تک ہے
کہ وہ ہے آستاں تک یہ خدا جانے کہاں تک ہے

کیفی چریاکوٹی

تمام عشق جنوں اور تمام حسن فسوں
جہانِ دیدۂ عاشق کی کائنات ہے حسن
زباں کی بات ہے کچھ اس پہ اختیار نہیں
نہ تم بتاؤ نہ کوئی بتا سکے مجھ کو،
مقامِ یاس پہ ٹھہری ہے آکے راہِ امید
چھلک گیا ہے بھرا جام، دستِ لرزاں سے

مقامِ حیرتِ عاشق، مگر فسوں نہ جنوں
جو کوئی حد ہو تو کہہ دوں کہ ہے وہ حد سے فزوں
ملے نجات جو دل سے تو دل کا حال کہوں
تمھیں بتاؤں میں سمجھوں تو تم کو کیا سمجھوں
یہی نگاہ کی منزل، یہی ہے دل کا سکوں
گرا نگاہ سے ساقی کے اب کہاں سنبھلوں

وہ صبح تھی صبح، آنسوؤں کی یہ شام ہے شام، سوزِ غم کی
خود اپنے ہاتھوں سے دینے والے نظر ادھر پھیر مسکرا کر
یہ رات تاریک یاس کی ہے، اسی میں اُمید پر نظر ہے
نفس نفس کے یہ سرد جھونکے امید اس سے لگائے رکھنا

کہاں جلے گا چراغ دل کا؟ اگر طبیعت بجھی رہے گی
نگاہ بھر دیگی دل کا دامن، اگر کرم میں کمی رہے گی
مٹا مٹا سا جو داغِ دل ہے اسی کی کچھ روشنی رہے گی
یہ آگ ہے زندگی کی کیفی یہ آگ دل میں لگی رہے گی

ساحر بھوپالی :-

وہ آج مجھ پہ ہیں کیوں مہرباں، نہیں معلوم
زمیں بدل گئی یا آسماں نہیں معلوم،

وہ بات بات پہ ہوتے تھے بدگماں، شاید
اُنھیں ابھی مری مجبوریاں نہیں معلوم

بنائے آشیاں رکھتا ہوں جس جگہ ساحر
وہیں پہ گرتی ہیں کیوں بجلیاں نہیں معلوم

کاش کہ ہو جائے پوری آرزوئے دید ہی
ورنہ دل میں حسرتیں تو اور بھی رکھتا ہوں میں

ساری دُنیا سے جُدا ہے میرا رنگِ عاشقی
جو مٹاتے ہیں انھیں سے دوستی رکھتا ہوں میں

کیا مٹا سکتی ہیں مجھ کو درد و غم کی سختیاں
جسپہ صدقے موت ہو وہ زندگی رکھتا ہوں میں

خستگی نے کر دیں آساں میری ساری مشکلیں
بس یہی اک چیز ساحر کام کی رکھتا ہوں میں

ہوئی رسوائی جذبات کتنی
بڑھتی ہے رفتہ رفتہ بات کتنی

خبر بھی ہے تجھے او بے مُروّت
کشش رکھتی ہے تیری ذات کتنی

قیامت ہو گیا نظروں کا ملنا
بڑھی ہے اک ذرا سی بات کتنی

نہ بجھ جائے کہیں شمعِ تمنّا
ابھی باقی ہے ساحر رات کتنی

درد کا اب اس طرح سے دل بڑھاتے جائیے
چوٹ کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے

میں بنانا ہی رہوں گا آشیاں پر آشیاں
آپ ہنس ہنس کر یونہی بجلی گراتے جائیے

کر ہی گزروں گا کوئی کارِ نمایاں عشق میں
آپ میری بے کسی پر مسکراتے جائیے

کٹ ہی جائے گی کسی صورت سے غمگیں زندگی
آپ تو دل سے مجھے اپنے بھلاتے جائیے

میری تقدیر میں جلنا ہے تو جل جاؤں گا
تیرا وعدہ تو نہیں ہوں کہ بدل جاؤں گا

مجھ کو سمجھاؤ نہ ساحر کہ میں اک دن خود ہی
ٹھوکریں کھا کے محبّت میں سنبھل جاؤں گا

مجھے اب ہاتھ دھونا ہی پڑیں گے دل سے اے ہمدم
جوانی ابتو ان کی اک قیامت ہوتی جاتی ہے

کروں اب شکوۂ خونِ تمنا کس لئے ساحر
کہ ابتو بے نیازی میری عادت ہوتی جاتی ہے

مطبوعات موصولہ

احوالِ غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو - جسے انجمن ترقی اُردو علی گڑھ نے بڑے اہتمام و سلیقہ سے نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے - ضخامت ۲۹۲ صفحات - سایز ۲۰ × ۲۶/۸ قیمت نو روپئے -

یہ کتاب در اصل ایک ترقی یافتہ اڈیشن ہے، علی گڈھ کالج میگزین کے غالب نمبر کا جو اس سے قبل شایع ہوکر ملک میں کافی شہرت و قبول حاصل کر چکا ہے -

غالب کی شاعری کے متعلق تو اس مجموعہ میں کوئی مقالہ نہیں ہے اور شاید چنداں اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ اس موضوع پر حالی کی یادگار غالب کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن غالب کا نسب نامہ ان کی خانگی زندگی، ان کا ماحول ان کے اعزہ و احباب اور اسی قسم کے اور متعدد مباحث ایسے تھے جن پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی اور فاضل مرتب نے اس میں شک نہیں اس فرض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے -

اس مجموعہ کی ترتیب میں بڑے اچھے اچھے اور مشہور اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غالب کے مطالعہ کے لئے حالی کی یادگار غالب جس قدر ضروری ہے، اتنا ہی اہم یہ مجموعہ بھی ہے -

اس کتاب میں غالب کی تحریروں کے عکس بھی دئے گئے ہیں اور ان کی متعدد تصاویر بھی جو مختلف ذرایع سے حاصل کی گئی تھیں - قیمت یقیناً زاید ہے، اور پرستاران غالب کی وہ جماعت جو زیادہ تر طبقۂ متوسط سے تعلق رکھتی ہے، بہت کم مستفید ہو سکے گی -

انتخاب طلسم ہوش ربا مرتبہ محمد حسن عسکری، جسے مکتبۂ جدید لاہور نے اپنی روایتی خوش سلیقگی کے ساتھ ٹائپ میں نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے - سایز ۲۰ × ۳۰/۱۶، ضخامت ۳۸۸ صفحات - قیمت چھ روپئے

اس میں شک نہیں طلسم ہوش رُبا اب ہمارے کلاسکی ادب میں شامل ہے، لیکن اس کا انتخاب اور وہ بھی صرف ۲۵ جزو کی کتاب میں بڑا دلچسپ خیال تھا جو سب سے پہلے محمد حسن عسکری صاحب کے ذہن میں آیا اور مکتبۂ جدید اسے کتابی صورت میں سامنے لایا

طلسم ہوشربا خیال آرائی کا ایک بے پایاں سمندر ہے اور جس حد تک اس کی داستان کا تعلق ہے، انتخاب کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن اس کی چند بنیادی خصوصیات کو سامنے رکھ کر ضرور اس کی کوشش کی جا سکتی ہے -

طلسم ہوش ربا کی بنیادی چیزیں، عمرو عیار کی عیاریاں، ساحروں کے کرشمہائے سحر اور بعض شاہزادیوں کا جنسی میلان ہے جنھوں نے مل جل کر اس کتاب کو ایک عجیب و غریب رومان کی صورت دیدی ہے، اس لئے داستان کے تسلسل کو سامنے رکھے بغیر بھی ان سے لطف اُٹھایا جا سکتا تھا، اگر ان خصوصیات کو مختصر طور پر پیش کر دیا جائے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عسکری صاحب نے اس خدمت کو بڑی خوبی سے انجام دیا ہے -

طلسم ہوش ربا کی تمام دفاتر کو پڑھنا اور ہزاروں صفحات کے مطالعہ کے بعد ایک ایسا انتخاب پیش کرنا جو کتاب کی اصل روح اور اس کے خصوصیات کا حامل ہو، آسان بات نہ تھی -

اس کتاب کی متعدد تصاویر بھی دی گئی ہیں جو میکسر مغرب کے Sur-realist آرٹ کی تقلید ہیں اور حد درجہ بھیانک ہیں -

پبلشر اور آرٹسٹ دونوں کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ یہ آرٹ مغرب میں بھی قبول نہیں ہوا چہ جائیکہ ہندوستان جہاں اس کے پسند کئے جانے کی کوئی عقلی، اخلاقی یا فنی توجیہ ممکن ہی نہیں۔

اگر ان کی جگہ واقعی ایسی تصویریں دی جاتیں جو جمالیاتی اور ہمارے ملک کے فنی ذوق کو پورا کرنے والی ہوتیں تو اس کتاب کو چار چاند لگ جاتے۔

تنقیدی آئینے مجموعہ ہے پروفیسر مبشر علی صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا جسے خود انھوں نے معمولی طباعت و کتابت کے ساتھ محلہ سوتھ بدایوں سے شایع کیا ہے۔ سایز ۲۰ × ۳۰/۱۶ ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ۸؎

پروفیسر صاحب کا یہ تیسرا مجموعہ ہے ادبی مضامین کا ہے۔ اس میں شخصی و اصولی دونوں طرح کے انتقادی مقالات شامل ہیں جنھیں انتقاد کے بجائے تاثرات انتقادی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ مضامین ہلکے پھلکے ہیں تاہم افادہ و دلکشی سے خالی نہیں۔

نوادرات سخن روداد ہے کل ہند لوحی مشاعرہ کی جو ۵۳ء کی نمائش علی گڑھ میں ہوا تھا۔ یونین بک ڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے اسے کتابی سایز پر شایع کیا ہے۔ ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ قیمت ۸؎

اس روداد میں بہت سے مشہور ادیبوں اور اکابر قوم کے پیغامات بھی شامل ہیں، جو پڑھنے کے قابل ہیں۔ غزلوں کے انتخاب میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر شاعر سے مختصراً اس کے حالات بھی قلمبند کرائے گئے ہیں اور اس طرح یہ روداد ایک نوع کا مختصر سا تذکرہ بھی ہوگئی ہے بعض شعراء کی عکسی تصاویر بھی شامل کردی گئی ہیں، جن سے اس روداد کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

شعراء اُردو کے تذکرے مقالہ ہے ڈاکٹر سید عبداللہ صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور کا جسے سب سے پہلے ۴۲ء میں رسالہ اُردو نے شایع کیا تھا اور اب مکتبہ جدید لاہور نے نہایت اہتمام سے ٹائپ کے حروف میں نفیس کاغذ پر کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔

اس مقالہ میں سب سے پہلے فارسی تذکروں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد بتایا ہے کہ ان کے زیر اثر اُردو میں کتنے اہم تذکرے کس کس زمانہ میں مرتب ہوئے اور ان کی کیا اہمیت ہے۔ یہ موضوع ایسا تھا کہ اس پر سب سے پہلے اہل قلم کو متوجہ ہونا چاہئے تھا، کیونکہ جب تک ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ شعراء کے حالات معلوم کرنے کے ماخذ بجائے خود کیا اور کیسے ہیں، کوئی صحیح رائے قایم نہیں ہوسکتی — اور — اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مقالہ کے ذریعہ سے اس خلا کو نہایت قابلیت کے ساتھ پر کیا ہے اور ضرورت ہے کہ ہر ادیب و نقاد اس کا مطالعہ کرے۔ قیمت دو روپیہ

Zahuri his and Work مقالہ ہے انگریزی کا جس پر اس کے مصنف پروفیسر نذیر احمد صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی) کو فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے اور جسے اب کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔

ظہوری فارسی کا بڑا مشہور ادیب و شاعر تھا جو دکن کے نظام شاہی اور عادل شاہی درباروں سے وابستہ تھا، اور اپنے تمام ہمعصر شعراء میں خاص امتیاز رکھتا تھا۔ اس کی اکثر تصانیف اساتذہ کے نزدیک معیاری حیثیت رکھتی تھیں اور عرصہ تک فارسی درسیات کے نصاب میں شامل رہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کے حالات زندگی اور شاعری پر یہ بسیط مقالہ لکھا ہے جو کتابی صورت میں ۳۶۸ صفحات کو محیط ہے۔ فاضل مصنف نے جس تحقیق و کاوش سے کام لیکر یہ کتاب مرتب کی ہے اس کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے کیونکہ تاریخی و انتقادی حیثیت سے بحث کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے ترک کردیا گیا ہو۔ یہ کتاب آٹھ روپیہ میں اشاعت گاہ خیابان۔ ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

کلاسکی ادب مجموعہ ہے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (صدر شعبہ اُردو دہلی کالج دہلی یونیورسٹی) کے پندرہ انتقادی مقالات کا جو مختلف رسایل و جرایدمیں شایع ہوکر ملک میں کافی مقبول ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں پہلا مقالہ "فن و روایت" ہے اور

دوسرا" جنگ آزادی میں اُردو کا حصہ" اور دونوں اپنی جگہ اصولی و تاریخی حیثیت سے بڑے کام کی چیز ہیں، اس کے بعد کے مقالوں میں میر غالب، مومن، مرزا شوق، ریاض، حسرت، فانی اور اصغر کی شاعرانہ خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور کوئی انتقادی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ ڈاکٹر فاروقی کا شمار اس وقت قدر اول کے ارباب نقد میں سے ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی تحریر میں جو شگفتگی و ادبیت پائی جاتی ہے وہ ہم کو دوسرے نقادوں میں بہت کم ملتی ہے۔ یہ کتاب ۲۵۲ صفحات کو محیط ہے اور آزاد کتاب گھر دہلی سے تین روپیہ آٹھ آنے میں مل سکتی ہے۔

پرند اور دوسرے افسانے مجموعہ ہے آصفہ مجیب کے آٹھ افسانوں کا جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ ان افسانوں کا موضوع بڑی حد تک اصلاحی و اخلاقی ہے اور پلاٹ، زبان و سلاست بیان کے لحاظ سے ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہم کو اپنی روز کی زندگی سے ہٹ کر ان پر غور نہیں کرنا پڑتا۔ شعر کی طرح فسانہ کی خصوصیت بھی یہی ہے کہ بغیر فکر کئے ہوئے ہم اس کے اثرات کو قبول کر لیں اور یہ خصوصیت ان افسانوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ——— ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ۱؎

دیوان صفی مجموعہ ہے مولانا صفی لکھنوی مرحوم کی چند منتخب نظموں اور غزلوں کا جسے مرحوم کے دوست شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری نے شایع کیا ہے۔ مولانا صفی کی شاعری کا آغاز اس زمانہ میں ہوا جب لکھنؤ میں غزل گوئی نام تھا صرف صناعت لفظی اور ظاہری نقش و نگار کا اور اختتام اُس وقت ہوا جب زمانہ کا رخ بالکل بدل چکا تھا اور لکھنوی شاعری میں بھی چولے ختم ہو کر معنویت پیدا ہو گئی تھی، لیکن اس تقریباً ۷۵ سال کے زمانہ میں مولانا صفی ہر دور میں نمود کے شاعر تسلیم کئے گئے اور انھوں نے کبھی تقلید محض کو اپنا اصول شاعری قرار نہیں دیا۔ دبستان لکھنؤ کے آخری دور میں غالباً وہ سب سے پہلے شاعر تھے جنھوں نے سوقیت و ابتذال سے کوئی واسطہ نہیں رکھا اور زمانہ کے رجحانات سے انحراف نہیں کیا۔ انھوں نے ۷۰ سال تک شاعری کی اور ایک بڑا ذخیرہ اپنے بعد چھوڑا، لیکن وہ نہ اسوقت تک شایع ہوا اور نہ آیندہ اس کی امید کی جا سکتی ہے، تاہم شیخ ممتاز حسین صاحب نے جو مختصر سا انتخاب شایع کیا ہے، وہ بھی صفی کا مرتبۂ شاعری جاننے کے لئے کافی ہے۔ یہ مجموعہ سرفراز پریس لکھنؤ سے دو روپیہ میں مل سکتا ہے۔

ہیروئن کی تلاش ڈرامہ ہے محمد مجیب صاحب کا لکھا ہوا جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ اس ڈرامہ کا اصل مقصود موجودہ فلمی ڈراموں کی اصلاح ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ آج کل اسٹیج، ڈرامہ اور فلمی کہانیوں کے سلسلہ میں عام طور پر صرف سطحی باتوں کو سامنے رکھا جاتا ہے اور فنی حیثیت سے ان میں خامیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ قیمت ۱۰؍ ضخامت ۶۴ صفحات۔

آب حیات کا تنقیدی مطالعہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا مقالہ ہے جسے کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ نے کتابی صورت میں شایع کیا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے ان الزامات کو دور کیا ہے جو "مصنف آب حیات" پر عاید کئے جاتے ہیں۔

مولوی محمد حسین "آزاد" بڑے فاضل شخص تھے، جو دنیائے ادب میں اپنے تذکرہ آب حیات کی وجہ سے خاص شہرت حاصل کر چکے ہیں، کیونکہ اُردو کا یہی وہ پہلا تذکرہ تھا جس نے تذکرہ نگاری میں انقلاب برپا کر دیا اور مستقبل کے تذکرہ نگاروں اور نقادوں کے لئے اک نئی راہ پیدا کر دی۔ "آب حیات" میں بہت سی باتیں ہم کو ایسی نظر آتی ہیں جو اس سے قبل کے تذکروں میں نہیں پائی جاتیں اور انھیں میں سے بعض کی صحت کی طرف سے شبہ کیا جاتا ہے، جن پر رضوی صاحب نے توجہ کی ہے۔ ضخامت ۹۲ صفحات۔ قیمت ۱؎

دست صبا فیض احمد فیض کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے، جسے آزاد کتاب گھر دہلی نے خاص اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ فیض موجودہ عہد کے روشن خیال اور آزادی پسند شعراء میں ایک مخصوص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کے افکار کا بڑی عزت وہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بڑی ترقی پسند شاعر ہیں، لیکن فنی حیثیت سے وہ بدستور اس روش کے مقلد ہیں جو کلاسکی شاعری کی جان ہے

اور یہی سبب ہے کہ جو اثر فیض کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ ان کے دوسرے ہمعصر ترقی پسند شعراء کے کلام میں مفقود ہے۔ فیض اپنے خیالات کو نئے زاویوں اور بدیع اسلوبوں سے پیش کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں اور اسی لئے جب ہم ان کا کلام پڑھتے ہیں تو ہم پر شدید تاثر کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ ضخامت ۱۱۰ صفحات۔ قیمت عہ

باپ بیٹے مشہور روسی مصنف تورگنیف کے ناول کا ترجمہ ہے جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ تورگنیف کا یہ ناول ادبیات عالم میں خاص شہرت رکھتا ہے اور ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ اردو میں بھی شایع کیا جاتا۔ اس کے مترجم انور عظیم صاحب ہیں جو ترجمہ میں اصل کتاب کی خوبیوں کو قایم رکھنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت پانچ روپیہ۔

مذہبی تصورات مجموعہ ہے مولانا اختر علی تلہری کے تیرہ مضامین کا جو "مذہبیات" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے ذریعہ سے فاضل مصنف نے مذہب کی حقیقت، خدا کا تصور، لامذہبیت کے اسباب اور مذہب و سائنس کے باہمی تصادم پر بڑی عالمانہ روشنی ڈالی ہے اور صرف منقولات کو حجت و استدلال کی بنیاد قرار نہیں دیا۔

ہرچند وہ اُن تمام اعتراضات کو دور نہیں کر سکے جو اس وقت منکرین خدا و مذہب کی طرف سے عاید کئے جاتے ہیں، کیونکہ مولانا نے صرف انھیں ملاحدہ و متشککین کو سامنے رکھا ہے جو موجودہ دور الحاد میں تقویم پارینہ کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم انھوں نے ان مسایل کو خود سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ جن راہوں سے گزرے ہیں ان کو پوری طرح ظاہر کر دیا ہے، ضخامت ۲۱۴ صفحات۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔

علوی تصورات یہ کتابچہ بھی مولانا اختر علی تلہری کی تصنیف ہے، جس میں انھوں نے جناب امیر علیہ السلام کی عظیم شخصیت اور جناب حسین کی فلسفۂ قربانی پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب ہرچند تاریخی حیثیت رکھتی ہے، لیکن چونکہ استدلال و استنتاج بالکل فلسفیانہ ہے اس لئے وہ اس موضوع پر دوسری مذہبی یا تاریخی کتابوں سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مولانا نے اس کتاب میں ان مسایل کو نہیں لیا جن سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے ضخامت ۱۹۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

اُجالے مجموعہ ہے انجم فوقی کی غزلوں کا۔ شروع میں باجد علی صاحب کا طویل مقدمہ ۶۴ صفحات کا شامل ہے اور اس کے بعد جوش بدایونی کا تبصرہ ۱۰ صفحات کا جن میں جناب انجم کی شاعری پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔

جناب انجم اس وقت کے خوشگو شعرا میں سے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس میں بڑی جان ہوتی ہے، فنی حیثیت سے وہ غزل کی قدیم روش کے پابند ہیں، لیکن خیالات کے لحاظ سے ان میں بڑی اپج پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، احساس کی شدت بھی ہے اور جذبات کا وزن بھی۔ افسوس ہے کہ اس کی طباعت و کتابت اس کے شایانِ شان نہیں ہے۔ قیمت عہ۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بدایوں۔

ادارۂ ادبیات اُردو انگریزی کا پمفلٹ ہے جس میں ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد کی خدمات کا جایزہ لیا گیا ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۳۱ء میں قایم ہوا تھا جس کے روح رواں ڈاکٹر قادری زور تھے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ادارہ ایسا ہو جس نے اتنی اہم خدمت زبان کی کی ہو، جتنی اس ادارہ نے انجام دی ہو خدا جانے اس نے کتنے مخطوطات فراہم کئے اور کتنے مقالے و رسایل شایع کئے۔

پھر اس ادارہ کی خدمات صرف دکن ہی کی کتابوں تک محدود نہیں رہیں بلکہ پورے ہندوستان کو محیط تھیں، ہرچند تقسیم ہند کے بعد اس کی کارکردگی بہت متاثر ہوئی ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ وہ اب تک فنا نہیں ہوا اور اس کی ممبری کی فہرست اب تک کھلی ہوئی ہے جو حضرات اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ ادارہ سے خط و کتابت کریں۔

شرح دیوان غالب اُردو طباطبائی کلام غالب کی جتنی شرحیں اس وقت تک لکھی گئی ہیں اُن میں مولانا طباطبائی کی شرح نہ صرف تقدم بلکہ معنویت کے لحاظ سے بھی خاص درجہ رکھتی ہے، بلکہ دیگر ادبی و فنی معلومات کے لحاظ سے بھی بڑی قابل قدر چیز ہے یہ شرح عرصہ سے بازار میں نایاب تھی اور اب انوار بک ڈپو لکھنؤ نے اسے دوبارہ شایع کردیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ کاغذ اور کتابت وطباعت کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور صحت کتابت کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ قیمت ۸ھ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔

پہلا پنج سالانہ پلان حکومت ہندوستان نے ملک کی اصلاح و ترقی و معاشی دشواریاں دور کرنے کے لئے ایک بڑا وسیع پلان بنایا ہے جو زراعت و حرفت اور صناعت و تعلیم وغیرہ کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتا ہے یقین ہے کہ یہ پلان پانچ سال میں پورا ہوجائے گا اور ملک خوشحالی کے ایک نئے دور میں داخل ہوگا۔

چونکہ اس پلان کی تفصیل عوام نہیں سمجھ سکتے تھے، اس لئے حکومت ہند کے شعبۂ نشرواشاعت نے اسے سوالات وجوابات کے انداز سے نہایت سادہ زبان میں شایع کردیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ پلان کو مقاصد واضح کرنے کے لئے یہ بڑا اچھا طریقہ ہے۔ یہ پمفلٹ آرٹ پیپر پر نہایت نفاست کے ساتھ شایع کیا گیا ہے اور ۴ر میں حکومت ہند کے شعبۂ نشرواشاعت سے مل سکتا ہے۔

حسرت موہانی عرصہ ہوا جناب عبدالشکور ام۔ اے نے اس نام سے ایک کتاب شایع کی تھی جس میں حسرت کے حالات، ان کے کلام کا تبصرہ اور انتخاب وغیرہ سب کچھ پایا جاتا تھا۔ یہ کتاب ملک میں بہت مقبول ہوئی اور اس کا دوسرا اڈیشن بھی ختم ہوگیا۔ اب تیسرا اڈیشن نظرثانی کے بعد شایع ہوا ہے جس میں دو ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ حسرت کے متعلق یہ کتاب بڑی جامع چیز ہے۔ اس میں وہ انتخاب بھی دیدیا گیا ہے جو حسرت مرحوم نے خود کیا تھا۔ طباعت و کتابت وغیرہ بھی اچھی ہے۔

ملنے کا پتہ :- انوار بک ڈپو لکھنؤ - قیمت ۶ھ

آپ بیتی تصنیف ہے۔ خان بہادر حکیم الدین صاحب کی جنھوں نے ساری عمر جنگل کی ملازمت میں بسر کی اور دوران ملازمت میں خدا جانے کتنے شیروں، تیندووں اور دوسرے صحرائی جانوروں کا شکار کیا۔ انھوں نے اس کتاب میں تمام واقعات شکار نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے ہیں اور متعدد تصاویر شامل کرکے اس کو اور زیادہ دلچسپ بنادیا ہے جو حضرات شکار کے شایق ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہ صرف دلچسپ بلکہ کارآمد بھی ہے، کیونکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس جانور کا شکار کس طرح کرنا چاہئے۔ ضخامت ۲۹۶ صفحات قیمت ۸ھ مصنف سے سنگاہی ضلع کھیری کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

تقویم ہجری وعیسوی اس کتاب میں ابوالنصر محمد خالدی ام۔ اے نے ۱ھ سے ۱۵۰۰ھ تک کے تمام سنین کی مطابقت ہجری سنین کے ساتھ دکھائی ہے۔ اور آپ ۱۵۰۰ سال کے اندر سن ہجری کے ہر تاریخ و مہینہ کے مقابلہ میں عیسوی تاریخ و مہینہ نہایت آسانی سے معلوم کرسکتے ہیں۔ عربی کی کتاب اخبار الطوال میں اسی قسم کی ایک طویل فہرست پائی جاتی ہے، لیکن اُردو میں کوئی ایسی چیز نہ تھی تاریخ پر کام کرنے والوں کے لئے یہ تقویم بڑے کام کی چیز ہے۔ قیمت ۸ھ۔ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو۔ کراچی

اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام تالیف ہے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی جسکی تیسری بار انجمن ترقی اُردو کراچی نے شایع کیا ہے اس کتاب میں فاضل مصنف نے تقریباً ۴۰ صوفیائے کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے اُردو ہی کے ذریعہ سے اخلاقی تعلیم کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور اس طرح اُردو کی ابتدائی نشوونما زیادہ تر انھیں حضرات کی ممنون ہے۔ قیمت ۱۲ھ

چند ہم عصر تصنیف ہے مولوی عبدالحق صاحب کی جس کا چوتھا اڈیشن اب انجمن ترقی اُردو کراچی نے شایع کیا ہے۔ اس میں اُن ۲۳ اکابر علم وادب کا ذکر ہے جن سے فاضل مصنف کو ذاتی طور پر ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کتاب میں یہاں کے شعراء وادباء کے ساتھ ساتھ (جن میں امیر مینائی سید محمود، حالی، چراغ علی، راس مسعود، محسن الملک، ڈاکٹر اقبال، حسرت اور ڈاکٹر بجنوری وغیرہ شامل ہیں) ایک جرمن پروفیسر کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور نام دیومالی کا بھی۔ کتاب بہت مفید و دلچسپ ہے۔ قیمت ۸ھ

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے اُن کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مانوین کا مذہب۔ نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے۔ جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون لطیفہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD. N. A 466

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں "مارس ہنڈس" کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران مصر عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاست کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور انکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آ سکے تھے اس نمبر میں تمام رامپور تا قیام حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات مشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرمانروایان اسلام نمبر) تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل ایک تاریخی کتاب ہے جو ہر گھر کے پڑھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

(باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)